THE TEACHINGS OF JESUS IN THE SYNOPTIC GOSPELS

by

The Ven'ble Archdeacon BARAKAT ULLAH, M.A., F.R.A.S.

کلمتہ اللہ کی تعلیم



مصنفہ

قسیس معظم آرچ ڈیکن برکت اللہ ایم اے

ایف - آر - اے - ایس

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی - لاہور

گلزار مسیح بھٹی

کلمۃ اللہ کی تعلیم

مُصنّفہ

قسیسِ معظّم آرچ ڈیکن برکت اللہ ایم۔ اے

فیلو آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ لندن

مصنّف

مسیحیت کی عالمگیری۔ توضیح العقائد۔ توراتِ موسوی اور

محمد عربی۔ دینِ فطرت صحتِ کُتبِ مقدسّہ۔ نور الہدیٰ

تاریخ کلیسیائے ہندوستان وغیرہ

بار دوم　　　　۱۹۵۲ء　　　　تعداد ۱۰۰۰

نوٹ

اقتباسات کے انگریزی حوالوں کو بحوالہ نمبر سلسلہ وار مختلف
ابواب کے تحت کتاب کے آخر میں الگ جمع کر دیا گیا ہے۔

برکت اللہ

پی۔ آر۔ بی۔ ایس پریس انار کلی لاہور میں باہتمام پادری آر۔ گبسن (پرنٹر و پبلشر
سیکرٹری پنجاب ریلجس بک سوسائٹی انار کلی لاہور چھپ کر شائع ہوئی)

فہرستِ مضامین

"ضرور ہے کہ ہم ایک ایسے شخص کا انتظار کریں جو اُس کی طرف سے آئے جو ہماری پرواہ کرتا ہے تاکہ وہ آکر ہم کو یہ بتائے کہ خُدا اور انسان کے ساتھ ہم کیا روّیہ اختیار کریں۔"

(سقراط)

"ہم ان باتوں کی نسبت کچھ علم نہیں رکھ سکتے جب تک کوئی شخص عالم بالا سے آکر ہم کو نہ بتلائے۔"

(سقراط)

"ہم یہ نہیں جان سکتے کہ ہم خُدا سے کیا عرض معروض کریں اور اُس کی عبادت کس طرح لائق طور پر کریں۔ پس لازم ہے کہ اِن امور کی تعلیم دینے کے لئے آسمان سے ایک مُقنّن آئے۔ ایسے شخص کو دیکھنے کو میرا جی تڑپتا ہے۔ اس مُقنّن کو ایک فوق البشر شخص ہونا چاہیئے تاکہ وہ ہم انسانوں کو اُن باتوں کی تعلیم دے سکے جو انسانی فطرت سے بعید ہے۔"

(افلاطون)

مقنن = قانون دان

مقدّمہ

دنیا میں غالباً اس سے زیادہ محیّر العقول کوئی امر نہیں ہوگا کہ علم و تہذیب سے دُور افتادہ ملک کنعان کے ایک جاہل اور حقیر صوبہ گلیل کے ایک معمولی غریب گھرانے میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس کی تعلیم اور شخصیت نے دنیا کی کایا پلٹ دی اُس نے غالباً صرف تین سال تک گلیل کے مچھوؤں اور دہقانوں میں توبہ اور خُدا کی محبّت اور بادشاہت کی منادی کی لیکن یہ تعلیم اس قدر دل پذیر اور مؤثر ثابت ہوئی کہ چند سالوں کے اندر اس کی گونج ہم کو فضائے عالم تک سنائی دیتی ہے۔ چار صدیوں کے اندر اندر اُس نے شاہ و گدا، عالم اور جاہل۔ آقا اور غلام کو اپنا گرویدہ اور شیدائی بنا لیا۔ اُس نے دو ہزار سال کے عرصہ میں دنیا کے تمام ممالک میں کروڑوں انسانوں کا میل اپنے خالق سے کرا دیا اور ایسی مقدّس اور برگزیدہ ہستیاں پیدا کر دیں جو زمین کا نمک تھیں۔ قیاصرہ نے جور و ظلم عقوبت و تعذیب کے ذریعہ اس تعلیم کو مٹانا چاہا لیکن وہ خود مٹ گئے۔ دنیا کے سرداروں اور سلطانوں نے اس کے خلاف اپنے پاپڑ بیلے لیکن وہ مغلوب نہ ہوئی۔ اس کا ہر دشمن دمِ واپسیں حسرت کے ساتھ یہی کہتا مر گیا۔ "اے گلیلی تو فاتح رہا" جہاں کہیں یہ تعلیم دی گئی اس کے آفتابی نور نے ظلمت کو مٹا دیا۔ جو شخص "دنیا کے نور" کا پیرو ہوگیا۔ اُس سے تاریکی کوسوں دُور بھاگی۔ بدعات اور جہالت کا قلع قمع ہوگیا اور حق کی روشنی ہر جانب پھیل گئی۔ تاریخ سکندریہ کے کلیمنٹ کے الفاظ کی صداقت کی گواہ ہے کہ "ہمارا استاد یسوع مسیح کلمۃ اللہ تمام بنی نوع انسان کا ہادی اور رہنما ہے"

دُور کیوں جاؤ اپنے ملک کو دیکھ لو۔ چہار سُو مذاہب کی اصلاح ہو رہی ہے یہ کیوں؟ اس لئے کہ کلمۃ اللہ کی روشنی نے ظلمت کدۂ ہند و پاکستان کو بقعۂ نور

بنا دیا ہے غیر مسیحی اپنے باطل عقائد کو اس نور کی روشنی میں ترک کر رہے ہیں اور اپنے مذہب کی کتر چھانٹ کر کے تاویلات اور اصلاح کر رہے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح اُن کی کتب کلمتہ اللہ کی تعلیم کی روشنی کے مقابل قائم رہ سکیں۔ ہندومت کی طرف نظر کرو۔ تو پچاس برس پہلے کے عقائد کی وقعت اب فضول قصص سے سے زیادہ نہیں رہی خود ہندو اس کے سوشل اور مذہبی قوانین سے علانیہ روگردانی کر کے برسرِ عام کہتے ہیں کہ شاستروں کے عقائد اس زمانہ کے لئے موزوں نہیں رہے۔ جن عقائد پر پچاس سال قبل اسلام فخر کیا کرتا تھا وہ اب اپنا منہ چھپا رہے ہیں۔ اب جہاد کی تعلیم۔ تعددِ ازدواج۔ نعمائے بہشت وغیرہ کی پادر ہوا تاویلات کی جاتی ہیں تاکہ اسلام پر سے تاریکی کا داغ دُور ہو سکے۔ خود قرآن کہتا ہے جاء الحق و زھق الباطل۔ ان الباطل کان زھوقاً (۱۷: ۸۳) یعنی حق آگیا اور باطل دُور ہو گیا ہے اور باطل نیست ہو جانے والی شے ہے۔

(۱) منجی عالمین کی تعلیم کی تاریخی صحت

اس مختصر رسالہ میں ہم کلمتہ اللہ کی تعلیم پر غور کریں گے لیکن اس سے پہلے یہ ضرور ہے کہ ہم اس تعلیم کی صحت اور اس کا پایہ اعتبار معلوم کریں پس ہم ابتدا میں ان سوالوں پر غور کریں گے کہ خداوند مسیح کی تعلیم کے ماخذ کیا ہیں اور ان ماخذوں کا تاریخی پایہ کیا ہے۔ ان سوالوں کا تسلی بخش جواب نہایت ضروری ہے کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ جو الفاظ انجیل جلیل میں مندرج ہیں وہ خداوند کی زبانِ معجز بیان سے نکلے ہیں تو ہمارے اذہان متاثر ہو سکتے ہیں اور ہماری قوتِ متخیلہ ایک معلوم شے کے ذریعے اثر کر کے اور ہمارے جذبات کو مشتعل کر کے ہمیں راہِ ہدایت پر لا سکتی ہے علاوہ ازیں ہم صرف اس صورت میں خدا کی مرضی کو جان سکتے ہیں۔ اور انجیلی بیان کو خدا

کی محبت کا مکاشفہ مان سکتے ہیں جب ہم کو اس امر کا پختہ یقین ہو جائے کہ کلمتہ اللہ کے اقوال صحیح تاریخ کے اصول پر پورے اترتے ہیں۔

بعض اصحاب کو یہ اندیشہ لاحق ہے کہ اگر انجیل جلیل کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے گا تو ہمارا ایمان متزلزل ہو جائے گا۔ لیکن یہ خیال باطل اور بے بنیاد ہے۔ خداوند نے خود فرمایا ہے کہ "تم کتاب مقدس کو ڈھونڈو" (یوحنا ۵: ۳۹ حاشیہ) اور مقدس پطرس کہتا ہے کہ "جو کوئی تم سے تمہاری امید کی وجہ دریافت کرے اس کے جواب دینے کے لئے ہر وقت مستعد رہو" (۱۔پطرس ۳: ۱۵)۔ منجی جہان خود راہ حق اور زندگی ہے پس حق کی جستجو میں ہم خداوند اور اس کی خوشخبری سے دور بھٹک نہیں سکتے۔ تنقید اور عقل حق کی دشمن نہیں بلکہ حق کی غلام ہیں۔

گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے اہل مغرب انجیل جلیل کی صحت کی جانچ پڑتال کر رہے ہیں۔ ہم یہاں نہایت مختصر طور پر ان کی مساعی کے صرف ان مسلم نتائج کا بیان کر سکتے ہیں جو خداوند مسیح کی تعلیم کے ماخذوں اور ان کی تاریخی صحت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

دور حاضرہ کی تحقیقات کا ایک نہایت ضروری اور اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ ہم کلیسیا کے علماء کے خیالات و تاویلات اور انجیل شریف کی تعلیم میں تمیز کر سکتے ہیں۔ زمانہ ماضی کے مصنفین یہ بات لازمی خیال کرتے تھے کہ کلمتہ اللہ کے انجیلی الفاظ کو کماحقہ سمجھنے کے لئے ان کو کلیسیائی تعلیم و عقاید کے مطابق ایک نظام میں منظم و منسلک کیا جائے۔ لیکن اب دور حاضرہ میں کلمتہ اللہ کے کلمات طیبات کو مقدم خیال کیا جاتا ہے اور آپ کے زرین اقوال سے ہی آپ کی تعلیم مستنبط کی جاتی ہے۔

اس زاویہ نگاہ کی تبدیلی سے عظیم الشان فرق پیدا ہو گیا ہے۔ منجی عالمین کے مبارک الفاظ انسانی ڈھانچوں میں ڈھالے نہیں جاتے۔ بلکہ وہ اپنی پہلی سی قدرت کے

ساتھ ہم سے اب بھی کلام کرتے ہیں اور اب بھی ویسے ہی اثر ریز ہیں۔ جیسے وہ شروع میں تھے۔

(۱) کلمۃ اللہ کی تعلیم کے ماخذ:-

خُداوند مسیح کی تعلیم اناجیل اربعہ میں محفوظ ہے۔ اب اگر ہم پہلی اور تیسری انجیلوں کو لیں اور کالی سیاہی سے ان تمام مقامات اور فقرات کو تحت الخط کریں۔ جو پہلی تینوں انجیلوں میں یکساں ہیں۔ تو ہم ذیل کے حیرت انگیز نتائج پر پہنچتے ہیں:-

(۱) انجیل دوم کا دو تہائی حصہ انجیل اوّل وسوم میں موجود ہے اور باقی ایک تہائی حصہ سوائے تین آیات کے انجیل اوّل میں یا انجیل سوم میں موجود ہے[۱]

(۲) انجیل اوّل کی تین چوتھائی سے زیادہ حصہ (۱۰۶۸ آیات میں سے ۷۱۶ آیات) اور انجیل دوم کی دو تہائی سے زیادہ حصہ (۱۱۴۹ آیات میں سے ۷۹۸ آیات) اُن آیات کا ہے جو انجیل دوم سے نقل کی گئی ہیں[۲]۔

(۳) اگر ہم پہلی اور تیسری انجیلوں کے باقی ماندہ مقامات اور فقرات کو جو ان دونو انجیلوں میں یکساں ہیں لال سیاہی سے تحت الخط کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ایسی آیات (جن کی تعداد ۲۳۶ ہے) ان دونوں انجیلوں کا ایک بڑا جزو ہیں اور یہ آیات تقریباً تمام کی تمام تعلیم پر مشتمل ہیں۔

مندرجہ بالا حقیقتوں سے تین اہم نتیجے اخذ ہوتے ہیں جو علماء[۳] کے نزدیک مسلم ہیں۔

اوّل پہلی اور تیسری انجیل کے لکھنے والوں نے مرقس کی انجیل کو نقل کیا ہے۔

دوم۔ پہلی اور تیسری انجیل کے لکھنے والوں کے سامنے انجیل مرقس کے علاوہ ایک اور رسالہ تھا جو اُنھوں نے نقل کیا ہے۔ اور جو تقریباً سب کا سب تعلیم پر مشتمل تھا لیکن جو اب ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ اس رسالے کو عموماً انگریزی حرف Q سے موسوم

کیا جاتا ہے۔ ہم اس کو حرف تہجی ک سے جو لفظ **کلمات** کا پہلا حرف ہے موسوم کرینگے
سوم۔ انجیل اوّل کے مصنّف نے انجیل سوم سے نقل نہیں کیا اور نہ انجیل سوم کے مصنّف نے انجیلِ اوّل سے نقل کیا ہے یہ دونوں اناجیل مختلف اوقات اور مختلف جگہوں میں لکھی گئیں۔

(۲) ماخذوں کی تاریخی صحت :۔

اب ہم ان ماخذوں پر یکے بعد دیگرے محققانہ نظر ڈالیں گے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں یا نہیں۔

اوّل۔ مقدس مرقس کی انجیل۔ یہ انجیل مقدس یوحنا مرقس نے لکھی ہے وہ غالباً خود منجیٔ عالمین کے شاگردوں میں سے نہیں تھے لیکن پہلے مقدس پولوس کے اور پھر مقدس پطرس کے ساتھی تھے۔ پس اُن کے پاس خداوند مسیح کے سوانح حیات اور اقوال کو معلوم کرنے کے لئے بہترین ذرائع تھے۔ چنانچہ بزرگ پےپئس (PAPIAS) (تاریخ پیدائش ۶۰ئہ) کہتے ہے "مرقس مقدس پطرس کا مترجم تھا اور اس نے مسیح کے اقوال اور افعال کو جو پطرس کو یاد تھے نہایت صحت کے ساتھ ترتیب وار تحریر کیا مرقس نے لکھنے میں کوئی غلطی نہ کی۔ بلکہ اُس نے اس امر کی خاص احتیاط کی کہ کوئی بات جو اس نے سُنی تھی قلم انداز نہ ہو جائے اور نہ کسی غلط بات کا اندراج ہو"

پس مقدس مرقس ایک محتاط اور مستند مؤرخ تھے اور اُن کا پایۂ اعتبار اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ انجیل اوّل اور سوم کے مصنّفین جو خود اعلےٰ درجہ کے نقاد تھے (نوٹ ۱) انجیل مرقس کو لفظ بلفظ نقل کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔

دوم۔ رسالہ ک (Q) جو اب موجود نہیں ہے یہ رسالہ تقریباً تمام کا تمام خداوند کی تعلیم پر مشتمل تھا۔ اس کی نسبت بھی بزرگ پےپئس جو یوحنا رسول کا شاگرد

تھا۔ لکھتا ہے "متی نے خداوند کے کلمات کو ارآمی زبان میں لکھا تھا اور ہر شخص نے اپنی اپنی طرز کے مطابق اس کا استعمال یا ترجمہ کیا" ہے ۱۵ء آئرینوس بھی اسکی تائید کرتا ہے اور کہتا ہے "متی نے عبرانیوں کے لئے اُن کی زبان میں انجیل تحریر کی"۔ ۱۶ء

ان فقروں کا اطلاق موجودہ انجیل اول پر نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ارامی میں نہیں بلکہ یونانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اور اس میں مرقس کی یونانی زبان کی انجیل لفظ بلفظ نقل کی گئی ہے۔ پس اغلب خیال یہی ہے کہ پے پیئس کا مطلب رسالہ ک سے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خداوند مسیح کے حواری ابتدا ہی سے خداوند کے اقوال کو احاطۂ تحریر میں لے آئے تاکہ کلمۃ اللہ کے اعجازی الفاظ ضائع نہ ہوں۔ اور آپ کے شاگرد خود ان سے مطلع ہو سکیں اور نو مریدوں کو بھی تعلیم دے سکیں۔ چونکہ یہ نسخہ قدیم ترین تھا۔ لہٰذا نہایت معتبر اور مستند تھا۔

نسخہ ک کے مضامین کیا تھے؟ اس موضوع پر علمائے مغرب مدت سے بحث کرتے آئے ہیں اور اب قریباً سب کے سب اس امر پر متفق ہیں کہ یہ رسالہ تعلیم پر مشتمل تھا۔ یہ رسالہ انجیل دوم سے پہلے لکھا گیا تھا۔ کیونکہ اس انجیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف یہ فرض کر لیتا ہے کہ اس کے ناظرین کے ہاتھوں میں ایک ایسا نسخہ موجود ہے جس میں منجئ عالمین کی تعلیم درج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ مقدس مرقس اپنی انجیل میں الفاظ "تعلیم" اور "تعلیم دینا" کو باقی دونوں انجیلوں سے زیادہ استعمال کرتا ہے تاہم وہ خداوند کی تعلیم کا ذکر بہت کم کرتا ہے بلکہ اس کی انجیل کا مرکز صلیبی واقعہ ہے۔ خداوند کی زندگی کے آخری ہفتے کے واقعات اس انجیل کے ⅓ حصہ سے زیادہ جگہ لیتے ہیں۔ درحقیقت یہ انجیل ایک تمہید اور صلیبی واقعہ کے بیان پر مشتمل ہے (بی۔ وائس B. WEISS)

اور دیگر علماء کے خیال میں نسخہ ک میں واقعاتِ تصلیب و قیامت بالکل نہیں تھے پس ثابت ہو گیا کہ انجیلِ مرقس کی تصنیف سے پہلے ایک نسخہ مسیحیوں کے ہاتھوں میں موجود تھا جس میں صرف کلمۃ اللہ کے کلماتِ طیبات ہی مندرج تھے۔ مقدس مرقس نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انجیل لکھی جس میں خداوند کی تعلیم کا مفصل ذکر نہ کیا۔ بلکہ خداوند کی زندگی کے چند واقعات کا ذکر کر کے واقعاتِ تصلیب و قیامت اور صعودِ آسمانی کا مفصل ذکر کیا کیونکہ یہ واقعات نسخہ ک میں نہیں تھے۔

میری رائے میں سر ولیم ریمزے (SIR WILLIAM RAMSAY) کا خیال درست ہے کہ نسخہ ک صرف خداوند کے زریں اقوال پر ہی مشتمل تھا اور اس میں صلیبی واقعہ کا ذکر نہیں تھا لہذا یہ نسخہ صلیبی واقعہ سے پہلے خداوند کی حینِ حیات ہی میں مرتب کیا گیا تھا لیکن دیگر علماء کا خیال ہے کہ یہ نسخہ خداوند کی وفات کے بعد لکھا گیا تھا بہر حال تمام علماء اس نسخہ کو قدیم ترین تسلیم کرتے ہیں پس کلمۃ اللہ کے اقوال کے لئے نسخہ ک سے زیادہ معتبر اور مستند رسالہ روئے زمین پر نہیں ہو سکتا۔

یہ نسخہ ک ہمارے ہاتھوں میں ایک جدا رسالہ کی شکل میں نہیں ہے لیکن چونکہ تمام کا تمام نسخہ انجیلِ اول اور انجیلِ سوم میں لفظ بلفظ نقل کیا گیا ہے لہذا یہ نسخہ در حقیقت ضائع نہیں ہوا۔ دونوں انجیلوں میں نقل ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ انجیل اول و سوم کے وہ مقامات جو تعلیم پر مشتمل ہیں نہایت معتبر اور مستند ہیں۔

سوم۔ انجیل سوم۔ یہ امر مسلم ہے کہ اس انجیل کو اور اعمال الرسل کو مقدس لوقا نے تصنیف کیا تھا۔ اس انجیل کے ابتدائی الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ مقدس

لوقا ایک نہایت محتاط مورخ تھے آپ نے اپنے ماخذوں کی جانچ پڑتال کرکے "سب باتوں کا سلسلہ شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت" کرکے اور صرف اُن لوگوں کی گواہی قبول کرکے "جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کلام کے خادم تھے"۔ اپنی انجیل کو "ترتیب" وار لکھا۔ انکی انجیل اس امر پر گواہ ہے کہ انہوں نے یہ کام نہایت دیانتداری جانفشانی اور سنجیدگی سے کیا پس یہ انجیل ایک نہایت مستند اور معتبر نسخہ ہے۔

چہارم۔ انجیل اوّل چونکہ انجیل اوّل کے مصنّف نے ک کا استعمال کیا تھا۔ جو مقدّس متّی نے لکھا تھا لہذا یہ انجیل مقدّس متّی کے نام سے موسوم ہوگئی۔ یہ انجیل مقدّس مرقس کی انجیل پر مبنی ہے۔ ڈھانچہ وہی ہے جو انجیل دوم کا ہے اور اس ڈھانچہ میں نسخہ ک سے آٹھ مقامات اور چند دیگر معتبر اقوال اور واقعات مختلف، موزوں اور مناسب موقعوں پر داخل کر دیئے گئے ہیں۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم ثابت کر آئے ہیں کہ یہ سب ماخذ تواریخی حیثیت سے نہایت اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ لہذا یہ انجیل بھی جو ان ماخذوں کو استعمال کرتی ہے معتبر اور مستند ہے۔

مذکورہ بالا چاروں کتابوں کی تاریخ تصنیف بھی ان کے معرز پایۂ اعتبار کی تائید کرتی ہے مسیحی علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کتب پہلی صدی مسیحی کے دوران میں لکھی گئیں چنانچہ عموماً یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انجیل مرقس یونانی زبان میں ۶۳ء اور ۷۰ء کے درمیان لکھی گئی اور انجیل اوّل وسوم سنہ ۶۰ و ۹۰ء کے درمیان لکھی گئیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری موجودہ یونانی انجیلیں خداوند مسیح کی وفات کے پچاس ساٹھ سال کے اندر اندر احاطۂ تحریر میں آگئی تھیں پس انکی تواریخ تصنیف ان کے معتبر ہونے پر ایک زبردست دلیل ہے۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ہماری چاروں انجیلیں مندرجہ بالا تاریخوں سے

بہت پہلے احاطۂ تحریر میں آ چکی تھیں۔ پادری ریکہم صاحب (RACKHAM) تفسیر اعمال الرسل میں مدلل اور مبسوط طور پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ اعمال کی کتاب ۵۸ء اور ۶۱ء کے درمیان لکھی گئی۔ آرچ ڈیکن ایلن (ARCH DEACON ALLEN) کے خیال میں انجیل اول ۵۰ء میں لکھی گئی چونکہ انجیل اول و سوم کے مصنفین ایک دوسرے کی تصنیفات سے مستغنی ہیں اور دونوں مقدس مرقس کی انجیل کا استعمال کرتے ہیں پس انجیل دوم ۵۰ء سے پہلے مختلف اور دور دراز مقامات میں مقبول عام ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ ۴۰ء کے قریب لکھی گئی یعنی خداوند مسیح کی وفات کے دس سال کے اندر اندر احاطۂ تحریر میں آ گئی جب واقعات صلیب و قیامت و صعود آسمانی ہنوز شاگردوں کے دلوں میں تازہ تھے۔ سر ولیم رمزے کا خیال ہم درج کر چکے ہیں کہ نسخہ ک خداوند کی عین حیات میں لکھا گیا تھا پس ان علماء کے خیال میں ہمارے اصلی ماخذوں میں سے ایک خداوند مسیح کی حیات میں لکھا گیا اور دوسرا آپ کی وفات کے دس سال کے اندر لکھا گیا اور سب سے بعد کی انجیل وفات کے صرف بیس سال کے اندر احاطۂ تحریر میں آئی۔ ان سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب کا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

پس اہل مغرب کی گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی مساعی جمیلہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہماری اناجیل لاثانی کتب مقدسہ ہیں اور اعتبار کے لحاظ سے وہ آپ ہی اپنی نظیر ہیں ہم اس کے ثبوت میں مشہور مصنف ایڈورڈ مائر (EDWARD MEYER) کے الفاظ کو پیش کرتے ہیں جس نے مخالفانہ نظر سے لیکن بغیر تعصب کے مسیحی کتب مقدسہ کی تنقید و چھان بین کی ہے اور جو ایسا مسلم الثبوت نقاد ہے کہ چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ وہ انجیل دوم کی نسبت لکھتا ہے کہ "وہ نتائج جس پر ہم پہنچے ہیں نہایت اہم ہیں یہ ظاہر ہے کہ مسیح کی سوانح عمری کے لئے ہمارے پاس دوسری یا تیسری نسل کے ماخذ نہیں ہیں بلکہ یہ ماخذ پہلی نسل کے لوگوں کے ساتھ متعلق

رکھتے ہیں جو اُس کو بخوبی جانتے تھے اور جن کے دلوں میں اُس کی یاد ہنوز تازہ تھی۔ ان ماخذوں کو قبول نہ کرنے کی ہمیں کوئی وجہ نہیں ملتی۔ وہ تمام ضروری امور میں تواریخی حیثیت سے قابلِ وثوق ہیں اور ان کے واقعات کی ترتیب تاریخی طور پر صحیح معلوم ہوتی ہے"۔ یہ نقاد انجیل سوم کو "قدیمی تواریخی تصنیفات میں سے نہایت اہم" کتاب قرار دیتا ہے۔ لہ

پس مخالف اور موالف اس امر پر متفق ہیں کہ ہماری موجودہ انجیلیں نہایت اہم اور اعتبار کے لحاظ سے دنیا کی تمام مقدس کتابوں میں عدیم المثال ہیں۔

4-03-15

(۳) اناجیل اور قرآن کے پایۂ صحت کا مقابلہ

جب ہم اناجیل ثلاثہ کی صحت کا مقابلہ دیگر مذاہب کی کتب سے کرتے ہیں تو ہم پر اناجیل کی بینظیری فوراً ظاہر ہو جاتی ہے۔ حضرت محمد صاحب کی حینِ حیات میں قرآنی سورتوں میں اس قدر تفاوت تھا کہ صحیح مسلم میں عمر بن خطاب کا قول ہے کہ "میں نے ہشام بن حکیم کو سورۂ فرقان اور لوگوں کے خلاف پڑھتے سنا اور رسول اللہ مجھ کو یہ سورہ پڑھا چکے تھے سو میں قریب تھا کہ اُس سے جھگڑ جاؤں مگر میں نے اُسے مہلت دی یہاں تک کہ وہ (نماز) پڑھ چکا۔ پھر میں نے اس کی چادر اس کے گلے میں ڈال کر اُس کو رسول اللہ تک کھینچتا لایا"۔ (کتاب فضیلۃ القرآن البخاری سے مشکوٰۃ میں) ابن مسعود سے روایت ہے کہ میں نے ایک شخص کو (قرآن) پڑھتے سنا اور میں نے نبی صلعم کو اس کے خلاف پڑھتے سنا تھا۔ پس میں اُس کو نبی صلعم کے پاس لایا"۔ (باب فضائل القرآن) زید بن ثابت ہم کو بتاتا ہے کہ "جب نبی صلعم نے وفات پائی تو قرآن کسی شے میں جمع نہ تھا"۔ (اتقان نوع ۱۹) حضرت ابوبکر کے عہدِ خلافت میں جب قرآن کے حافظ جنگِ یمامہ میں کثرت سے قتل ہو گئے۔

اور یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ بہت سا حصہ قرآن کا ضائع ہو جائے تو زید بن ثابت نے جا بجا قرآن کو کھوج کیا اور اس کو کھجور کے پتوں پتھر کی تختیوں۔ کاغذ کے پرزوں چمڑے کے پارچوں، شانے کی ہڈیوں، پہاڑی ہڈیوں اور کجاوہ کی لکڑیوں اور آدمیوں کے سینوں پر نہایت منتشر حالت میں پایا۔ لیکن حضرت عمر کے قرآن کو مرتب کرنے کے باوجود خلافت عثمانیہ میں قرآن میں اس قدر اختلاف موجود تھا کہ حضرت عثمان کو از سر نو قرآن کی تالیف کرنی پڑی۔ اور اس نے مصحف عثمانی کے سوا تمام قرآن کے نسخے اور صحیفے نذرِ آتش کر کے ان کثیر التعداد اختلافات کا خاتمہ کر دیا۔

قرآن جلا دیا

اسلامی احادیث کا کچھ نہ پوچھو۔ امام بخاری نے حضرت محمد کی وفات کے تقریباً اڑھائی سو سال بعد چھ لاکھ احادیث جمع کیں لیکن صرف چار ہزار کو مستند قرار دیا اور چالیس ہزار راویوں میں سے صرف دو ہزار کو معتبر سمجھا۔ امام مسلم نے حضرت محمد کی وفات کے اڑھائی سو سال بعد تین لاکھ حدیثیں جمع کیں لیکن صرف چار ہزار کو صحیح یا تقریباً صحیح قرار دیا۔ ابو داؤد نے حضرت محمد کی وفات کے تقریباً پونے تین سو سال بعد پانچ لاکھ احادیث جمع کیں لیکن صرف چار ہزار آٹھ سو کو درج کر کے کہا کہ دو مؤلف نے اپنی کتاب میں صحیح کو جمع کیا ہے اور انکو جو مجھے [illegible] زیادہ ہوئیں نے صحیح خیال کیں۔ اس قدر کاوش کے بعد بھی علمائے اسلام ان کتب کی احادیث میں سے ایک بڑی تعداد کو غیر معتبر، ضعیف، موضوع اور بے سر و پا تصور کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا واقعات اس امر کی دلیل ہیں کہ اصلی اسلامی تعلیم کو معلوم کرنے کیلئے اسلامی ماخذ کس قدر ناقص اور پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ ہر روشن خیال شخص دیکھ سکتا ہے کہ ان ذرائع اور مسیحی تعلیم کے ماخذوں کے پایۂ اعتبار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

3-03-15

(۴) انجیل چہارم

ہم نے دیدہ دانستہ انجیل چہارم کا ان ماخذوں کے تحت میں ذکر نہیں کیا۔ نقاد اناجیل ثلاثہ کی نسبت مسلّمہ نتائج پر پہنچ چکے ہیں۔ لیکن انجیل چہارم ہنوز زیر بحث ہے۔ اس کا طرز تحریر و تقریر اناجیل ثلاثہ کی طرز تحریر و تقریر سے جداگانہ ہے۔ لیکن اس کے ذکر نہ کرنے سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ یہ انجیل پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

اسکا تواریخی پایہ بہت بڑا ہے مثلاً تقریباً سب علماء اس امر پر متفق ہیں کہ واقعۂ تصلیب کی صحیح تاریخ صرف اسی انجیل میں محفوظ ہے۔ پھر اناجیل ثلاثہ ہم کو کنایۃً بتاتی ہیں کہ کلمۃ اللہ نے یروشلیم اور یہودیہ میں بھی منادی کی تھی لیکن یہ منادی صرف اسی انجیل میں محفوظ ہے اور اس انجیل کی تعلیم یہودیہ کے حسب حال بھی ہے کیونکہ وہاں گلیل کے جاہل نہیں۔ بلکہ علمائے فقیہہ اور فریسی رہتے تھے علاوہ ازیں یہ ایک امر ناممکن ہے کہ کلمۃ اللہ نے اپنی تین سالہ زندگی میں صرف وہی کلمات فرمائے ہوں جو اناجیل ثلاثہ میں مندرج ہیں۔ اور ان کے علاوہ آپ کی زبان معجز بیان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا ہو۔ لہذا یہ امر یقینی ہے کہ انجیل چہارم کے اگر تمام کلمات نہیں تو اکثر کلمات حضور خداوند کے منہ سے صادر ہوئے تھے۔ لیکن اس رسالہ میں چند وجوہ کے باعث ہم خداوند مسیح کی تعلیم کو معلوم کرنے کے لئے انجیل چہارم کا تفصیلی ذکر نہ کریں گے اور اس میں سے صرف اُن کلمات اور واقعات کو اختیار کریں گے جو اناجیل ثلاثہ کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور ان اناجیل کی تعلیم پر روشنی ڈالتے ہیں کیونکہ مخالف و موافق دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ اناجیل ثلاثہ میں منجیٔ عالمین کی تعلیم محفوظ ہے۔

(۵) انجیل کی زبان اور متن کی صحت

بعض اصحاب انجیلی تعلیم کی صحت پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کلمۃ اللہ نے تو ارامی زبان میں تعلیم دی۔ لیکن انجیل یونانی زبان میں ہے لہذا زبان کے اختلاف کا اثر مسیحی

تعلیم پر ضرور پڑا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ آنخداوند کی مادری زبان ارآمی تھی چنانچہ ڈاکٹر فرڈریلڈ کہتا ہے "مسیح یونانی زبان نہیں بولتے تھے اس میں شک نہیں کہ وہ ارآمی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے جو اُس زمانہ میں کنعان کی زبان تھی" لیکن اس اعتراض میں کچھ وزن تب ہی ہو سکتا ہے جب معترض یہ ثابت کر سکے کہ کلمۃ اللہ کے ارآمی کلمات اور موجودہ اناجیل کے یونانی الفاظ میں مغائرت اور تضاد ہے۔ جو اشخاص ارآمی اور یونانی زبانوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مغائرت اور تضاد تو ایک طرف دونوں میں حیرت انگیز مطابقت ہے۔

ہم سطور بالا میں لکھ آئے ہیں کہ حضرت کلمۃ اللہ کی حینِ حیات ہی میں آپ کے کلمات طیبات ارآمی زبان میں احاطۂ تحریر میں آچکے تھے علاوہ ازیں جن رسالوں کا ذکر مقدس لوقا کرتا ہے (۱:۱) وہ بھی ابتدائی زمانہ میں ارآمی زبان میں تحریر ہو چکے تھے اور یہ ایک قدرتی بات بھی تھی۔ کیونکہ آنخداوند کے اولین شاگرد یہودی تھے جن کے لئے ارآمی زبان میں ان رسالوں کا ہونا لازمی امر تھا تاکہ وہ خداوند کے کلمات اور سوانح حیات سے خود واقف ہو سکیں اور دوسروں میں ان کی تبلیغ کر سکیں۔

کتاب اعمال الرسل سے ظاہر ہے کہ صعود آسمانی کے واقعہ کے چند سالوں کے اندر اندر غیر یہود ہزاروں کی تعداد میں مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو گئے اور یہ تحریک سلطنت روم کے ہر قریہ اور شہر میں پھیلتی گئی۔ پس ضرورت کو مدنظر رکھ کر ان غیر یہود مسیحیوں کے لئے اُن رسالوں کا یونانی زبان میں ترجمہ کیا گیا تاکہ مختلف ممالک کی طلب بائیں انجیل کے جانفزا مژدہ سے بہرہ ور ہو سکیں۔

منجئ عالمین کی وفات کے تیس سال بعد یروشلیم کی بربادی کا سانحہ عجانکاہ پیش آیا اور یہودی قوم خستہ اور تباہ حال ہو کر پراگندہ ہو گئی جس کی وجہ سے ارآمی زبان ختم ہو گئی اور یونانی زبان کو ہر مہذب ملک میں بیش از پیش فروغ حاصل ہو گیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اناجیل اربعہ کی نقلیں ارآمی زبان میں کم اور یونانی زبان

میں زیادہ ہوتی گئیں حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا جب ارامی زبان کے نسخے نادر ہو کر آہستہ آہستہ معدوم ہو گئے۔ اور دوسری تیسری صدی مسیحی سے صرف یونانی زبان کے نسخے ہی نقل ہوتے گئے۔

ڈاکٹر توری (C. C. Torrey) پروفیسر برنی (BURNEY) آرچ ڈیکن ایلین (ALLEN) وغیرہ علماء کا گروہ کہتا ہے کہ اناجیل اربعہ کا یونانی متن ان ارامی اناجیل کا لفظی ترجمہ ہے جو ۵۰ء اور ۶۰ء کے درمیان یعنی مسیحِ عالمین کی وفات کے دس بیس سال کے اندر اندر انجیل نویسوں نے ارامی زبان میں تصنیف کی تھیں دیگر علماء کا یہ خیال ہے کہ یونانی اناجیل اصل ارامی ماخذوں سے ۶۰ء کے بعد تصنیف کی گئیں لیکن تمام کے تمام علماء اس ایک امر پر متفق ہیں کہ آنخداوند کی ارامی زبان اور موجودہ یونانی متن میں کسی قسم کی مغایرت نہیں ہے چنانچہ یہاں ڈاکٹر ہارنیک (HARNACK) جیسے مسلم الثبوت نقاد کے الفاظ نقل کر دینے کافی ہوں گے۔ وہ کہتا ہے "یونانی زبان جس میں اناجیل لکھی گئی ہیں۔ ان تحریرات پر ایک شفاف پردے کی طرح ہیں اور بغیر کسی کوشش کے ان کی عبارت عبرانی یا ارامی زبانوں میں ترجمہ ہو سکتی ہے۔ یہ اظہر من الشمس ہے کہ جو باتیں ان میں محفوظ ہیں ان کا تعلق ابتدائی زمانے سے ہے اور وہ اصلی ہیں صہ ۱۲"

پس ہر پہلو سے کلمۃ اللہ کی تعلیم کی صحت ثابت ہے۔

باب اول مسیح کی آمد کے وقت ارضِ مقدس کے حالات

(۱) سیاسی حالات۔ جب خداوند مسیح اس دنیا میں آئے تو رومی قیاصرہ

اہل یہود پر حکمران تھے۔ آپکی آمد سے تقریباً ساٹھ سال پہلے رومی جرنیل پومپئی (POMPEY) نے یروشلیم فتح کر لیا تھا۔ اور حشمونی خاندان کے آخری یہودی بادشاہ اور اُس کے ہزاروں ماتحتوں کو مقید کر کے روم لے گیا تھا لیکن گو قیاصرۂ روم اہل یہود پر قابض ہو گئے تھے تاہم شروع میں وہ یہودیہ پر اپنے گورنروں کے ذریعہ حکومت نہیں کرتے تھے پس ۳۷ء قبل مسیح میں روم نے ہیرودیس اعظم کو ارضِ مقدس پر حکمران مقرر کیا۔ یہ شخص نسلاً ادومی تھا جن سے اہل یہود سخت عداوت رکھتے تھے۔ ہیرودیس یہودی مذہب رکھتا تھا لیکن یونانیت کی جانب بہت راغب تھا۔ جہاں اُس نے خداوند یہوواہ کے لئے یروشلیم میں ایک ہیکل کھڑی کر دی تھی وہاں مشرکانہ معبودوں کے لئے اُس نے مختلف ممالک میں جا بجا شہر آباد کئے تھے اور عظیم الشان مندر بھی تعمیر کر دیئے اسکا لشکر جرار تھریس، جرمنی اور بنگال (THRACE, GERMANY & GAUL) کے باشندوں سے بھرا پڑا تھا اور اگر اس کو کسی شخص کی وفاداری پر شبہ ہوتا تو فوراً اُس کا کام تمام کر دیتا حتیٰ کہ وہ اپنے خاندان کے شرکا کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اور اُسنے انمیں سے بہتیروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ بالآخر خداوند مسیح کی پیدائش کے ایک دو سال بعد (۴ ق۔م) اس نے وفات پائی اس کے بعد اس کی مملکت اس کے بیٹوں میں تقسیم کر دی گئی۔ لیکن ملک میں فتنہ و فساد بڑھتا گیا۔ اور بغاوتوں کی وجہ سے خون کی ندیاں بہہ گئیں چنانچہ ہیرودیس کی موت کے تھوڑی دیر بعد دو ہزار یہودی یروشلیم میں مصلوب کئے گئے۔ لیکن صورت حالات نہ بدلی۔ نو سال تک یہی حال رہا بالآخر قیصر اگسطس نے بجز اس کے کوئی چارہ نہ دیکھا کہ یہودیہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے قیصرہ میں ایک گورنر مقرر کر دے۔ کلمۃ اللہ کی بعثت کے وقت پنطوس پلاطوس پانچواں گورنر تھا۔ اُس نے دس سال تک (از ۲۶ء تا ۳۶ء) حکومت کی۔

(۲) اہلِ یہود کے مذہبی فرقے

اہلِ یہود شرک کے جانی دشمن اور موحد تھے۔ وہ توحید کے قائل اور انبیاءاللہ اور کتب سماوی کے ماننے والے تھے خداوند مسیح کے ہم عصر یہودیوں کے عموماً دو فریق تھے۔

اوّل صدوقی۔ اس پولیٹیکل پارٹی میں بالعموم یہودی امراء شرفاء اور سردار کاہن داخل تھے۔ یہ لوگ یونانی خیالات سے متاثر ہو چکے تھے لہذا کٹر یہودی خیالات کے نہیں تھے۔ رومی زمانہ میں گو ان کا اقتدار کم ہو گیا تھا تاہم سردار کاہن اسی پارٹی کے ممبر ہوتے تھے۔ یہودیوں کی مجلس سنہیڈرن میں ان کو بڑا رسوخ حاصل تھا۔ اس مجلس کو رومی فرمانرواؤں کے ماتحت بڑا اختیار حاصل تھا۔ صدوقیوں کا حلقۂ رسوخ زیادہ تر یروشلیم کا علاقہ اور ہیکل کی چاردیواری تھی لہذا ان کو اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لئے اپنے مخالف فریسیوں کی پالیسی پر عمل درآمد کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ عوام الناس میں ان کا رسوخ بڑا زبردست تھا۔ چونکہ ان کا نصب العین اپنے حقوق کی حفاظت اور ملک کی سیاسی فلاح و بہبودی تھی۔ لہذا قومی اور مذہبی پاکیزگی کی طرف وہ چنداں دھیان نہیں کرتے تھے۔ چونکہ وہ مرفہ الحال تھے لہذا وہ موجودہ حالات سے خوش اور ہر طرح کے انقلاب سے متنفر تھے کیونکہ اُن کو ہر وقت یہ خدشہ دامنگیر تھا کہ کہیں رومی فاتحین اُن کے حقوق اور اختیارات نہ چھین لیں (یوحنا ۱۱: ۴۸) درحقیقت یہی لوگ تھے جنہوں نے ابن اللہ کو مصلوب کروایا تھا۔ (مرقس ۱۵: ۱۰-۱۱)

دوم۔ فریسی۔ عوام الناس میں فریسیوں کے خیالات گھر کر چکے تھے۔ کیونکہ خداوند کے زمانہ کی یہودیت درحقیقت فریسی خیالات پر ہی مشتمل تھی۔ چونکہ یہ جماعت اہلِ شرک کے ساتھ قید بابل کے زمانہ سے برسرِ پیکار رہی۔ لہذا اس کے شرکاء

ہمیشہ کٹر خیالات کے تھے۔ خُدا کی وحدانیت، عبادتخانوں کی نماز، عہدِ عتیق کی کتب اور ان کے فقیہوں کی تفاسیر و روایات، روزِ سبت پر سختی سے عملدرآمد اور اہلِ شرک کی رسوم سے بیزاری، اس جماعت کے اجزائے ایمان اور طغرائے امتیاز تھے۔ مکابیوں کے زمانہ میں (از ۱۶۵ ق م تا ۱۰۵ ق م) یہ پارٹی صدوقیوں سے الگ ہو گئی تھی۔ ان کی حتی الوسع یہ کوشش تھی کہ جس طرح صدوقی سردار کاہن ہیکل کی چار دیواری کے اندر رسمی طور پر پاک رہتے تھے وہ اپنی روزمرہ زندگی میں رسمی پاکیزگی حاصل کریں۔

فریسیوں کی تعلیم ذیل کے امور میں صدوقیوں کی تعلیم سے مختلف تھی۔

(۱) صدوقی غالباً صرف موسوی شریعت یعنی عہدِ عتیق کی پہلی پانچ کتب کے قائل تھے لیکن فریسی اس کے علاوہ دیگر صحائفِ انبیاء اور "باپ دادوں کی روایات"، علم فقہ کو بھی اشد ضروری خیال کرتے تھے۔ (متی ۱۵: ۲ + مرقس ۷: ۳)

(۲) فریسی حیات بعد از ممات۔ قیامت، فرشتگان۔ جنت و دوزخ۔ عالم ارواح اور مسیح موعود کی بادشاہت کے قائل تھے۔ لیکن صدوقی ان امور کو نہیں مانتے تھے۔ (متی ۲۲: ۲۳ + مرقس ۱۲: ۱۸ + اعمال ۲۳: ۸)

(۳) فریسی مسئلہ جبر اور خود مختاری کے قائل تھے۔ لیکن صدوقی جبر اور تقدیر کے منکر تھے۔

(۴) فریسی محبِ وطن تھے لیکن خُدا کو سیاسی سلطان مان کر ہر طرح کے دنیاوی بادشاہ (یہودی اور غیر یہودی) کے مخالف تھے۔

(۵) فریسی یہودیت کی تبلیغ کے حامی تھے۔ اور غیر اقوام کو یہودیت کے

حلقہ میں داخل کرتے تھے۔ ربّی ہلیل کا قول ہے کہ "لوگوں کو پیار کرو۔ اور ان کو شریعت کے پاس لاؤ"۔ لیکن صدوقی تبلیغی کوششوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

(۲) صدوقیوں کا حلقۂ رسوخ ہیکل کی چار دیواری تک محدود تھا۔ لیکن فریسیوں کا رسوخ عبادت خانوں اور ربیوں کی درسگاہوں کے ذریعہ عوام الناس میں پھیلا ہوا تھا۔

فریسیوں کا ایک بڑا گروہ ایسا تھا جس کے شرکا تین گواہوں کے سامنے یہ وعدے کیا کرتے تھے کہ وہ تمام اشیائے خوردنی پر زکوٰۃ ادا کریں گے "اور گنہگاروں کے ساتھ کسی طرح کا میل جول نہیں رکھیں گے اور رسمی پاکیزگی کو ہمیشہ مدِّنظر رکھیں گے۔"

فریسیوں کی ایک بڑی تعداد فقیہوں کی تھی۔ شریعت اور احکام الٰہی اور بزرگوں کی روایات کا مطالعہ کرنا ان کا شب و روز کا شغل تھا (زبور ۱: ۲) اسی فاضل گروہ کے اصولوں پر فریسی چلتے تھے (متی ۲: ۱۴+ لوقا ۵: ۳۰) چونکہ صدوقی بھی توریت شریف پر ایمان رکھتے تھے۔ لہٰذا اُن کے بھی فقیہہ تھے جو صرف شریعت کے مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ اناجیل سے ظاہر ہے کہ فقیہہ اعلیٰ مراتب پر فائز تھے کیونکہ جہاں سردار کاہنوں اور بزرگوں کا ذکر آتا ہے وہاں فقیہہ بھی اسی زمرہ میں شمار کئے جاتے ہیں (متی ۲۰: ۱۸+ لوقا ۲۰: ۱+ متی ۲۶: ۵۷ وغیرہ) فقیہوں نے عوام میں کاہنوں کی جگہ غصب کر لی تھی۔ اور لوگوں کو عبادت خانوں میں اور ربیوں کی درسگاہ میں تعلیم دیتے تھے۔ عوام الناس ان سے مرعوب رہتے تھے۔ انہی فقیہوں کے جانشینوں نے مابعد کے زمانہ میں طالمود کو مرتب کیا۔ اس گروہ کے اندر بھی اختلافات اور فرقہ بندیاں موجود تھیں۔ مثلاً ہیرودیس اعظم کے زمانہ میں ربّی ہلیل

اور ربی شمعون کے مقلدین موجود تھے لیکن گروہ کے باہر ہر شخص انکے فتاویٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرتا تھا۔

کلمۃ اللہ کے زمانہ میں یہودی دین اصلاح کی سخت محتاج تھی۔ یہودی ربیوں نے شریعت پر کاربند ہونا اخلاقی زندگی کا مترادف قرار دے رکھا تھا۔ پس ان کا یہ خیال تھا کہ جو شخص شریعت کو جانتا اور اس پر عمل کرتا ہے وہ نیک ہے اور جو شریعت کو نہیں جانتا اور اُس پر عمل نہیں کرتا وہ بد ہے لیکن شریعت ظاہری افعال پر ہی نگاہ کر سکتی ہے لہذا فریسی انسانی جذبات اور خیالات کو محسوب نہیں کرتے تھے علاوہ ازیں بزرگوں کی روایات نے لوگوں کا دم ناک میں کر رکھا تھا۔ کیونکہ اوّل تو شریعت پر کاربند ہونا کوئی آسان امر نہیں تھا اس پر طرہ یہ کہ بزرگوں کی روایات پر کاربند ہونا بھی شریعت کی طرح لازمی قرار دیدیا گیا تھا۔ حالانکہ اُن قوانین میں سے چند ایسے تھے جن پر عمل کرنا اچھا نہ تھا (مرقس ۷: ۱۱-۱۲) عوام الناس کے لئے یہ قوانین بڑے بھاری بوجھ تھے اور جو ان پر عمل کرتے تھے وہ اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ و افضل شمار کرتے تھے (لوقا ۱۸: ۱۱-۱۳) جسکا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی روحانی حالت روز بروز زوال پذیر ہوتی گئی۔

جس طرح فریسی اور فقیہہ یہود عامتہ الناس کو بنظر حقارت دیکھتے تھے اُسی طرح اہل یہود دیگر اقوام عالم کو بنظر حقارت دیکھتے تھے۔ اور اپنے آپکو افضل و اعلیٰ خیال کرتے تھے۔ آل ابراہیم میں سے ہونا اُنکے لئے مابہ ناز تھا۔ اور یہی فخر انکے مذہب کا جزو لاینفک تھا اور وہ اپنے آپکو خدا کی برگزیدہ قوم خیال کرتے تھے۔ اور دیگر اقوام عالم سے الگ تھلگ رہتے تھے تاکہ ناپاک نہ ہو جائیں۔ وہ آل ابراہیم ہونا جنت میں داخل ہونے کے لئے کافی سمجھتے تھے پس وہ اپنے اخلاق کو سدھارنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے چنانچہ فاضل یہودی ڈاکٹر مونٹی فیوری (MONTEFIORE)

کہتا ہے کہ اہلِ یہود کو اس امر کا پختہ یقین تھا کہ وہ آلِ ابراہیم ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کی زندگی کی برکات میں شریک ہوں گے۔ ان کا یہ ایمان تھا کہ باستثنائے چند انتہائی گنہگاروں کے تمام یہود کا حصہ ہمیشہ کی زندگی میں ہوگا۔

مُنجیٔ عالمین کے زمانہ میں ہم کو اچھے اور بُرے فریسی دونوں ملتے ہیں۔ جہاں ایسے فریسی تھے جنہوں نے صدوقیوں کے ساتھ سازش کر کے ابن اللہ کو صلیب دلوا دی تھی۔ وہاں زکریا۔ یوسف۔ الیسبات شمعون اور یوسف آرمتیاہ جیسے راستباز فریسی بھی موجود تھے۔

گلیل کا صوبہ فریسیوں کا محکم قلعہ تھا۔ اسکے باشندے مسیح موعود کی آمد کے انتظار میں رہتے تھے۔ وہ رومیوں کے غلام تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ خدا نے اُن کو آزادی عطا کی ہوئی ہے یہی وجہ تھی کہ یہ صوبہ ان تمام بغاوتوں کا مرکز تھا۔ جو رومی حکومت کے خلاف ہوتی تھیں اُنکے سرغنہ بھی گلیلی ہوتے تھے اور جو شخص بھی مسیح ہونے کا دعویٰ کرتا وہ اُس کے پیچھے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ان میں انتہا پسندوں کا ایک گروہ تھا جو غیرت مند یا زیلوتیس Zealots کہلاتا تھا۔ خداوند کا ایک شاگرد بھی اس گروہ کا ممبر تھا۔ (لوقا ۶: ۱۵)

(ج) خداوند کا طریقۂ تعلیم

اناجیل میں کلمۃ اللہ کی نسبت بہت سی باتیں مندرج ہیں۔ لیکن جو بات سب سے زیادہ آپ کی نسبت بار بار تحریر کی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ ایک معلم تھے جو سبت و روز لوگوں کو تعلیم دینے میں مشغول رہتے تھے۔ آپ

کی تعلیم صرف کلمات پر ہی مشتمل نہ تھی۔ بلکہ آپ اپنی نشست و برخاست رفتار و گفتار۔ انداز گفتگو۔ اور طرز زندگی وغیرہ کے کامل نمونہ سے نہایت مؤثر طور پر تعلیم دیتے تھے۔

(۱) کلمتہ اللہ کا مکتب

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ گلیل کا صوبہ فریسی خیالات کا ایک محکم قلعہ تھا کلمتہ اللہ کے خیالات نے اس فضا میں پرورش پائی تھی۔ آپ نے شریعت اور صحف انبیاء کا بخوبی مطالعہ فرمایا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے صحیفہ فطرت کا مطالعہ بھی کیا تھا جسکی جھلک ہمکو اناجیل میں ملتی ہے۔ آپ ہمیشہ آسمانی باپ کی رفاقت میں رہتے تھے۔ اور اس رفاقت نے آپ پر الٰہی معرفت کے کرشمے ظاہر کر دیئے تھے جو آپکی زبان حقیقت ترجمان سے صادر ہوتے تھے آپکی جدت پسند طبع فریسیوں اور ربیوں کی تعلیم سے مستغنی تھی آپ کتب سماوی کی ایسی نرالی تفسیر کیا کرتے تھے کہ سامعین انگشت بدنداں رہجاتے اور بے اختیار کہتے کہ وہ انکو فقیہوں کی طرح نہیں بلکہ صاحب اختیار کی طرح تعلیم دیتا تھا"(مرقس ۱: ۲۲ + متی ۷: ۲۸-۲۹) یہی وجہ تھی کہ وہ عام لوگ خوشی سے" آپ کی تعلیم کو سنتے تھے۔ (مرقس ۱۲: ۳۷) یہاں تک کہ بھیڑوں کی بھیڑیں آپ کی تلاش کرتی ہوئی آپ کے پاس آکر منت کرتیں کہ"ہمارے پاس سے نہ جا"۔ (لوقا ۴: ۴۲) جب ہم ربیوں کی تفسیروں کے بعد کلمتہ اللہ کے اقوال پڑھتے ہیں۔ تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک تنگ و تاریک زندان سے جہاں دم گھٹتا تھا آزاد ہو کر خدا کی عطا کردہ تازہ ہوا میں نکل آئے ہیں۔ عہد عتیق کی کتب سماوی کے حقیقی اور اصلی مطالب اور مقاصد کو کلمتہ اللہ نے کما حقہ سمجھا۔ آپکی تعلیم سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ

آپ میں اور خدا میں کوئی درمیانی نہیں تھا اور آپ سیدھا خُدا سے حاصل کرکے لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔ آپ نے خود فرمایا "جو ہم جانتے ہیں وہ کہتے ہیں اور جسے ہم نے دیکھا ہے۔ اُس کی گواہی دیتے ہیں" (یوحنا ۳: ۱۱) آپ یہودی ربیوں کے اقوال کا حوالہ نہیں دیتے تھے "آپ یہ نہیں کہتے تھے کہ میرے فلاں استاد نے فلاں بات کہی ہے۔ آپ کبھی کبھی شریعت اور صحف انبیاء کا ذکر کرتے تھے لیکن آپ نے ان کتب کو اپنی تقریر یا الفاظ کی بنیاد نہ بنایا۔ آپ وہی پیغام دیتے تھے اور وہی کلام منہ سے نکالتے تھے جو خدا کی روح آپکو بولنے پر راغب کرتی تھی"[۱۶]

لیکن فریسیوں، فقیہوں اور ربیوں کی نگاہ میں کلمتہ اللہ عامتہ الناس میں سے ایک جاہل تھے جنہوں نے کسی یہودی ربی کے قدموں میں بیٹھ کر علم الٰہیات کی تحصیل نہیں کی تھی۔ یہودی ربی اُن لوگوں کو جو ربیوں کے قدموں میں بیٹھ کر حاصل نہیں کرتے تھے "جاہل" "حیوانِ مطلق" "سامری" وغیرہ کہتے تھے[۱۷]۔ کلمتہ اللہ جیسے "اُمی" اور ناتجربہ کار تیس سالہ جوان کا بزرگان دین کو کہنا کہ "تم گمراہ ہو کیونکہ نہ کتاب مقدس کو جانتے ہو نہ خدا کی قدرت سے واقف ہو" (مرقس ۱۲: ۲۴) انکی نظر میں پرلے درجے کی حماقت اور ناقابل برداشت گستاخی تھی۔ یہودی ربیوں کا طبقہ رجعت پسند تھا ان کا یہ قاعدہ تھا کہ مکھی پہ مکھی مارتے تھے۔ اور مروجہ عقائد سے باہر ایک قدم بھی نہیں رکھتے تھے جب تک ان کے قول کے لئے ان کے پاس متقدمین سے کسی مستند عالم کی سند موجود نہ ہو۔ ؏

آنچہ اُستادِ ازل گفت ہماں میگویم

فقیہہ عام معنوں میں "صاحب اختیار" معلم تھے۔ وہ اسرائیلی نظام کے مقبول شدہ اور مقرر کردہ استاد تھے لیکن گو عوام الناس جاہل تھے تاہم انہیں اس قدر عقل ضرور تھی کہ وہ اِن معلموں میں اور خدا کے فرستادہ

معلم ہیں ہیز کر سکیں جب وہ کلمتہ اللہ کی زبان معجز بیان سے الٰہی حقائق سنتے تو بے ساختہ بول اٹھتے کہ "آپ ان کو فقیہوں کی طرح نہیں بلکہ صاحب اختیار لوگوں کی طرح تعلیم دیتے تھے (مرقس ۲: ۷) کلمتہ اللہ جو ان فریسیوں کی آنکھوں میں ایک معمولی نوخیز جوان تھے (متی ۱۳: ۵۶) نہ کسی مستند عالم کی سند کی پرواہ کرتے تھے اور نہ کسی مروجہ عقیدہ کا لحاظ رکھتے تھے بلکہ ظاہری رسوم و رواج کو بیدریغ پاؤں تلے روندتے تھے۔ اور ایسی تعلیم دیتے تھے جس سے ربیوں کے کان مانوس نہیں تھے اور جو بعض اوقات ان کی نظر میں کفر سے کم نہ تھی (مرقس ۲: ۷) پس وہ چڑ کر آپے سے باہر ہو جاتے اور کلمتہ اللہ سے پوچھتے "تو ان کاموں کو کس کے اختیار سے کرتا ہے؟ وہ کون ہے جس نے تجھکو یہ اختیار دیا ہے؟ (مرقس ۱۱: ۲۸ + لوقا ۲۰: ۲) یہودی ربی کتابوں کے کیڑے تھے جو بات بات پر مسلم الثبوت استادوں اور بزرگانِ دین اور مقتدایانِ یہودیت کے اقوال اپنی تائید میں پیش کیا کرتے تھے اور منطقیانہ استدلال سے کام لیتے تھے لیکن معرفت الٰہی کی کنجی کلمتہ اللہ کے پاس ہی تھی۔ کیونکہ عشق الٰہی کی آگ آپ کے سینہ میں بھڑک رہی تھی۔ مرحوم ڈاکٹر اقبال کیا خوب فرماتے ہیں:-

شنیدم شب در کتب خانۂ من
بہ پروانہ می گفت کرم کتابی
با اوراق سینا نشیمن گرفتم
بسے دیدم از نسخۂ فاریابی
نفہمیدہ ام حکمت زندگی را
ہماں تیرہ روزم زبے آفتابی
نکو گفت پروانۂ نیم سوزے

کہ ایں نکتہ را در کتاب بے نیابی
تپش مے کند زندہ تر زندگی را
تپش مے دہد بال و پر زندگی را

(۲) کلمتہ اللہ کے سامعین

فریسی معلّم عوام الناس کو بنظرِ حقارت دیکھتے تھے لفظ "فریسی" کا مطلب ہی "عوام الناس سے الگ" رہنا ہے۔ ان کا مقولہ تھا کہ "یہ عام لوگوں جو شریعت سے واقف نہیں لعنتی ہیں"۔ (یوحنا ۷: ۴۹)، "وہ گھنونے ہیں۔ اور ان کی عورتیں ناپاک حشرات الارض ہیں"۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ وہ عام لوگوں کو چھونے سے ناپاک ہو جاتے ہیں۔ عوام جس پھل کو ہاتھ لگائیں وہ ناپاک ہو جاتا ہے اور کہ وہ حیوانات سے بدتر ہیں اور ان کی شہادت قابلِ قبول نہیں ۱ھ ربّی ہلیل کا قول تھا کہ "کوئی اجڈ گنوار گناہ کرنے سے نہیں جھجک سکتا اور عامتہ الناس صالح نہیں ہو سکتے ۱۹" حکم تھا کہ "اگر ان میں سے کوئی شخص صالح بھی ہو تو بھی اُس کے پڑوس میں مت رہو۔ اُن کے عبادت خانوں میں اُن کے پاس بیٹھنا موت سے بدتر خیال کیا جاتا تھا ۲ھ"

لیکن کلمتہ اللہ عوام الناس کو کوڑ مغز بے بصیرت یا ملعون خیال نہیں کرتے تھے بلکہ آپ کی دلی آرزو تھی کہ عام لوگ پیغام الٰہی کو سُنیں۔ اور سوچ سمجھ کر اُس کو قبول کریں (متی ۱۳: ۱۶) آپ کا دل عوام الناس کی ابتر حالت کو دیکھ کر بھر آتا (متی ۱۴: ۱۴) کیونکہ ان کا کوئی حقیقی معلّم اور ہمدرد نہ تھا "وہ اُن بھیڑوں کی مانند تھے جن کا چرواہا نہ ہو"۔ (مرقس ۶: ۳۴) اُن کی جہالت آپ کے دل میں بے صبری کی جگہ ترس اور محبت کے جذبات پیدا کرتی تھی (متی ۹: ۳۶) یہی وجہ تھی کہ جہاں ربیوں میں اور عوام میں عداوت رہتی حتیٰ کہ ربی الیعزر کہتا ہے کہ "کفارہ کے روز عوام ہیں

سے کسی کو قتل کرنا بھی جائز ہے وہاں عوام الناس "خوشی سے" آپ کی تعلیم کو سنتے تھے۔ (مرقس ۱۲: ۳۷) آپ ہر وقت اور ہر جگہ الٰہی محبت کا پیغام لوگوں کو سناتے تھے اور فرماتے تھے کہ آپ اسی مقصد کو انجام دینے کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہیں (لوقا ۴: ۴۳ + مرقس ۱: ۳۷) لوگ جوق در جوق آپ کا کلام معجز نظام سننے کے لئے آتے۔ بعض اوقات شہر کا شہر جمع ہو جاتا (مرقس ۱: ۳۳) جب آپ تعلیم دیتے تو "اتنے آدمی جمع ہو جاتے کہ دروازہ کے پاس جگہ بھی نہ رہتی (مرقس ۲: ۲) چونکہ گھر اتنے بڑے جم غفیر کیلئے تنگ ہوتا۔ آپ باہر جھیل کے کنارے چلے جاتے تاکہ وہاں تعلیم دیں (مرقس ۲: ۱۳) لیکن بعض اوقات وہاں بھی بھیڑ اس قدر جمع ہو جاتی کہ کھوے سے کھوا چھلتا (لوقا ۵: ۴) اور آپ قلت جگہ کے باعث خود کشتی میں بیٹھ کر تعلیم دیتے (مرقس ۳: ۷-۹) بعض اوقات بھیڑ بھی کشتیوں میں سوار ہو کر آپ کی تعلیم سے مستفیض ہونے کی خاطر جھیل کے دوسرے کنارے پہنچ جاتی (یوحنا ۶: ۲۲ و ۲۴) اور کبھی کئی دن تک آپ کی تعلیم سے فیض حاصل کرتی (مرقس ۸: ۲) ارض مقدس میں صدیوں سے کسی نبی کی آواز سنی نہ گئی تھی۔ (زبور ۷۴: ۹ وغیرہ) پس جائے تعجب نہیں کہ جب خدا کا مرسل برگزیدہ آیا تو ہزاروں اس کا پیغام سننے کے لئے کوسوں پیدل پا جاتے۔

عوام الناس کے نزدیک آپ "ناصرت کے نبی" تھے جو عاموس۔ یسعیاہ اور یرمیاہ کی مانند تھے پس گاؤں کے گاؤں آپ کا دیدار حاصل کرنے کے لئے اور آپ کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہونے کی خاطر دور دور سے آتے جب آپ دیکھتے کہ عوام الناس بخوشی تمام آپ کے پیغام کو سننے اور قبول کرتے ہیں تو آپ خدا کا شکر بجا لاتے اور کہتے "اے باپ آسمان اور زمین کے خداوند میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے یہ باتیں داناؤں اور عقلمندوں سے چھپائیں اور بچوں پر ظاہر کیں" (متی ۱۱: ۲۵) آپ نے ان مفلس اور غمزدہ لوگوں کو جن کیلئے زندگی دوبھر ہو گئی تھی۔ دعوت

دی اور فرمایا" اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو سب میرے پاس آؤ۔ میں تم کو آرام دوں گا" متی ۱۱: ۲۸

(۳) حلقۂ حواریین

عوام الناس کو تعلیم دینے کے علاوہ کلمتہ اللہ نے حواریوں کا ایک حلقہ اپنے گرد جمع کیا۔ اس حلقہ میں بہت شامل ہو جاتے لیکن خداوند نے انکی تعداد کو بارہ سے بڑھنے نہ دیا (مرقس ۳: ۱۳-۱۴) جب ہم آنخداوند کے انتخاب پر نظر کرتے ہیں تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ آپ نے اپنے پیغام کی تبلیغ کے لئے کسی عالم یا دولتمند یا ذی اثر اور بارسوخ ہستی کو نہ چنا بلکہ آپ نے جاہلوں ناداروں اور مچھووں وغیرہ کو جو دنیا کی نظر میں حقیر تھے اس کار عظیم کے لئے منتخب فرمایا اور یہ طریقہ کار ہماری نظروں میں عجیب ہے کیونکہ جب دنیا دار انسان کسی تحریک کو شروع کرتے ہیں تو وہ کسی مقتدر ہستی کی تلاش کرتے ہیں جو اپنے رسوخ سے اس تحریک کو چلا سکے لیکن خداوند کا یہ طریقہ نہ تھا۔ آپ نے غریب طبقہ کے بارہ افراد کو اپنے خاص شاگرد بنایا۔ اور ان شاگردوں کو کلمتہ اللہ نے خاص طور پر تعلیم دینی شروع کی تاکہ وہ دوسروں کو تعلیم دینے کے قابل ہو سکیں (متی ۱۰: ۲۷+ مرقس ۴: ۷-۱۳- + لوقا ۱۰: ۱-۲۰) عوام الناس کو تعلیم دینے کے بعد ان حواریوں کو آپ خاص طور پر تعلیم دیتے اور خلوت میں آپ انکو اپنے کلمات طیبات کا مطلب سمجھاتے (مرقس ۴: ۱۰ اور ۳۴) آپ نے رفتہ رفتہ انکے ذہن کھولے تاکہ وہ موجودہ اور آئندہ واقعات کی روشنی میں آپ کی تعلیم کے مفہوم کو بخوبی سمجھ سکیں یہ طریقہ کارگر ثابت ہوا اور انہی حواریوں میں سے ایک نے آپ کے مسیح موعود اور ابن اللہ ہونے کا اقرار کیا۔ انہی حواریوں کو آپ نے اپنی زندگی

کے آخری ایام میں صلیب کے پیغام کی تعلیم دی (مرقس ۹: ۳۱) اور صلیبی موت کے مفہوم کو سمجھایا۔ (مرقس ۱۰: ۱۹+۱۴: ۲۲-۲۴+لوقا ۲۴: ۲۵-۲۶+روملیوں ۶: ۶) آپ نے اُن کے ذہن نشین کر دیا کہ ان کو تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑیگا۔ (متی ۵: ۱۱+مرقس ۸: ۳۴+۱۳: ۹-۱۳ وغیرہ) غرضیکہ کلمتہ اللہ نے اپنے حواریوں کو جہاں تک اُن کی ناقص عقل سمجھ سکتی تھی سمجھایا۔ آپ نے اُن کو خاص طور پر تعلیم دی تاکہ وہ "قوت سے ملبس" ہو کر یروشلیم اور تمام یہودیہ اور سامریہ میں بلکہ زمین کی انتہا تک"۔ (اعمال ۱: ۸) آپ کی تعلیم کی اشاعت کر سکیں۔ تاریخ اِس امر کی گواہ ہے کہ منجیٔ عالمین کی اشاعت انہی گنوار اور دہقانی حواریوں کے ذریعہ اکناف عالم میں ہوئی اور یہ آپ کے طریقۂ تعلیم کے مؤثر ہونے کا بیّن ثبوت ہے +

کلمتہ اللہ کی طرز تعلیم:-

کلمتہ اللہ نے لوگوں کو دیگر معلّموں کی طرح تعلیم نہ دی۔ آپ نے افلاطون یا ارسطو یا شنکر آچاریہ کی مانند نہ تو فلسفیانہ کتب تصنیف کیں اور نہ اپنی تعلیم کو فلسفیانہ لباس پہنایا۔ آپ نے اپنی تعلیم کی بنیاد منطقی قضایا پر نہ رکھی اور نہ اُن قضایا کے لئے آپ نے مضبوط دلائل اور بیّن براہین پیش کیں کیونکہ

؎ پائے استدلالیاں چوبیں بُود
پائے چوبیں سخت بے تمکین بُود

آپ نے علما اور حکما کے طبقہ کے سامنے مناظرہ اور مباحثہ نہ کیا۔ لیکن تاہم آپ کی تعلیم نے دُنیا کی کایا پلٹ دی جس نے سماج کے تمام طبقوں کو متاثر کر دیا حتیٰ کہ ماہی گیروں اور گنہگار عورتوں تک کے اذہان کھول دیئے

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ آپ نے کبھی اپنی تعلیم کا ایک لفظ بھی اپنے دستِ مبارک سے نہ لکھا۔ لیکن آپ کا کلام گو زبانی تھا پر لازوال تھا۔ آپ جانتے تھے کہ آپ کے مبارک الفاظ لوحِ محفوظ کے الفاظ سے بھی الواحِ دل پر زیادہ محفوظ رہینگے اور آپ نے فرمایا۔ "آسمان اور زمین ٹل جائینگے لیکن میری باتیں ہرگز نہ ٹلیں گی"۔ (متی ۲۴: ۳۵)

آپ کا طریقہ تعلیم دُنیا بھر سے نرالہ تھا۔ آپ نے لوگوں کو تقریباً تیس چھوٹی چھوٹی کہانیوں یا تمثیلوں کے ذریعہ تعلیم دی یہ تمثیلیں نہایت خوبصورتی سے کلمتہ اللہ کی تعلیم کو پتھر کی لکیر کی طرح سادہ لوگوں کے ذہن نشین کر دیتی ہیں ان کی سادگی اور لطافت نہایت نازک طور سے آج بھی ہمارے دلوں کو بطرزِ احسن متاثر کرتی ہے اور کلمتہ اللہ کی زبانِ معجز بیان نے ان تمثیلوں کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ وہ آپ ہی اپنی نظیر ہیں ہر ملک اور زمانہ کے لوگوں کے دلوں کو وہ اپنی طرف کھینچتی ہیں اور جاہل و عالم ادنیٰ و اعلیٰ ہر طبقہ کے لوگوں کو اپیل کرتی ہیں۔

تمثیلیں خداوند مسیح کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہیں گو آپ سے پہلے اہلِ یہود تمثیلوں سے ناواقف نہ تھے لیکن آپ اس دنیا میں پہلے شخص تھے جس نے تمثیلوں کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنایا۔ عہدِ عتیق کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکے حواریوں نے تمثیلوں کے ذریعہ کبھی تعلیم نہ دی۔ تاریخ ایسی کسی اور شخص کا پتہ نہیں بتاتی جس نے یہ طریقہ استعمال کیا ہو پس صرف کلمتہ اللہ ہی اکیلے مذہبی پیشوا ہیں جس نے اپنی تعلیم تمثیلوں کے ذریعہ دی ہے پس جس طرح آپ کی شخصیت بے نظیر ہے۔ اسی طرح اُن کا طریقہ تعلیم بھی لاثانی اور بے عدیل ہے۔

خداوند اپنی تمثیلوں میں اکثر ایسی اشیا کا ذکر کرتے تھے جو عام ہیں اور روزمرہ مشاہدے میں آتی ہیں پس سننے والا نہایت آسانی سے اُن کو یاد رکھ

سکتا تھا اور اِن اشیا کو بار بار دیکھنے سے اِن تمثیلوں کی یاد اُس کے دِل میں ہمیشہ تازہ ہو جاتی تھی۔ خداوند کے ہاتھ میں زندگی کی نہایت معمولی اشیاء تمثیلوں کے ذریعہ سبق آموز ہو گئیں۔ اِن تمثیلوں کے معانی نہایت بامطلب تھے۔ اور ہر شخص جس کے سر میں دماغ اور دماغ میں سمجھ تھی، اور جو الٰہی اُمور کی بابت شوق رکھتا تھا، اِن تمثیلوں کو عموماً سمجھ سکتا تھا اور بعض اوقات کلمتہ اللہ خود اِن کا مطلب اپنی زبانِ حقائق ترجمان سے سمجھا دیتے تھے۔ (متی ۱۳ باب)

تمثیلوں میں تعلیم دینے کا منشا یہ بھی تھا کہ لوگ خُدا کی بادشاہت کے اُمور کی نسبت متجسس ہوں۔ یہ تمثیلیں "بادشاہت کے بھیدوں" کو متلاشیوں پر ظاہر کر دیتی تھیں لیکن کاہل لوگ جن کو خدا کے کلام کا شوق نہیں تھا۔ اِس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے تھے۔ یہ بھی اس ازلی قانون کی مثال ہے کہ جس کے پاس ہے اُسے دیا جائیگا لیکن جس کے پاس نہیں ہے اُس سے وہ بھی جو اُس کے پاس ہے لے لیا جائیگا۔" (متی ۱۳: ۱۲) قسم دوم کی جماعت کو یہ موقع تھا کہ وہ تعلیم حاصل کر سکیں لیکن وہ سمجھنے کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اِس صداقت کو خُداوند نے اِن الفاظ میں ادا کیا۔ آپ نے فرمایا۔ "وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سُنتے ہوئے نہیں سُنتے اور نہیں سمجھتے۔ اِس اُمت کے دِل پر چربی چھا گئی ہے اور وہ کانوں سے اُونچا سُنتے ہیں اور اُنہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنکھوں سے معلوم کریں اور کانوں سے سُنیں اور دِل سے سمجھیں اور رجوع لائیں اور میں اُن کو شفا بخشوں"۔ (متی ۱۳: ۱۳-۱۵) قسم اوّل کے اشخاص خُدا کی بادشاہت کے اُمور کی تلاش کرتے ہیں اور اُن کو "آسمان کی بادشاہی کے بھیدوں کی سمجھ دی گئی ہے"۔ (متی ۱۳: ۱۱) خُداوند اُن کی نسبت فرماتے ہیں۔ "مبارک ہیں اُن کی آنکھیں کیونکہ وہ دیکھتی ہیں اور اُن کے کان

اِس لیۓ کہ وہ سُنتے ہیں"۔ (متّی ۱۳: ۱۶)

کلمتہ اللہ کی تمثیلیں ایک اور امرِ اہم منکشف کرتی ہیں کہ اشیائے فطرت اور رُوحانی اُمور میں تطبیق ہے آپ سے پہلے کسی شخص نے اس حقیقت کو نہ پایا آپ پہلے معلّم تھے جس کی تعلیم سے یہ معلوم ہوا کہ رُوحانی مزاج اشخاص کے لیۓ تمام خلقت ایک تمثیل ہے۔ جو خالق کو لاپروا لوگوں سے چھپاتی ہے۔ مگر بالبصیرت لوگوں پر ظاہر کرتی ہے۔ کلمتہ اللہ اسی خلقت کی معمولی اشیا کو اُن رموز کو ظاہر کرنے کے لیۓ استعمال فرماتے ہیں جو بنائے عالم کے وقت سے پوشیدہ رہی ہیں۔ (متی ۱۳: ۳۵) جرمن فلاسفر شیلنگ (Shellong) کہتا ہے کہ فطرت ایک تمثیل ہے اور تاریخ اس کی ایک تاویل ہے۔ کلمتہ اللہ کے نزدیک فطرت اور تاریخ دونوں تمثیلیں ہیں اور خُدا کی بادشاہت ان تمثیلوں کی تاویل ہے۔ عبادتخانوں میں مُنجی عالمین عہدِ عتیق کے صحیفوں کی تشریح فرماتے تھے لیکن تمثیلوں میں آپ نے صحیفۂ فطرت کی تاویل فرمائی۔ اور دونوں قسم کے صحیفوں سے رُوحانی حقائق خلق اللہ پر ظاہر فرما دیۓ۔

۵۔ کلمتہ اللہ کے کلام کی فصاحت و بلاغت۔

کلمتہ اللہ کی طرزِ تعلیم میں ایک اور بات قابلِ غور ہے آپ نے عبرانی نظم کے طریقہ کو اختیار فرمایا جو عہدِ عتیق کے صحفِ انبیاء اور مزامیر میں موجود ہے کلمتہ اللہ کا کلام معجز نظام مختلف صنعتوں سے بھرا پڑا ہے اور فصاحت و بلاغت سے پُر ہے۔ جب ہمارے اُردو ترجمہ میں اُس کا لُطف موجود ہے تو ارامی زبان میں اِس کا لُطف دوبالا ہوگا۔

بعض اوقات ایک ہی خیال کو دو مختلف شکلوں میں دو مصرعوں میں ادا کیا

گیا ہے۔ مثلاً

جو میری طرف نہیں وہ میرے خلاف ہے اور
جو میرے ساتھ جمع نہیں کرتا بکھیرتا ہے
(لوقا ۱۱: ۲۳)

یا

تیرا یہ بھائی مُردہ تھا اب زندہ ہُوا
کھویا ہوُا تھا، اب ملا ہے
(لوقا ۱۵: ۳۲)

بعض اوقات صنعتِ تضاد کا استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو
جو کوئی اپنی جان بچائیگا وہ اُسے کھوئیگا
جو کوئی میرے اور انجیل کے واسطے اپنی جان کھوئیگا۔ وہ اُسے
بچائیگا۔
(مرقس ۸: ۳۵)

بعض اوقات دُوسرے مصرع میں پہلے کی تشریح کی گئی ہے۔ مثلاً
زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو
کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمان پر ہے (متیّ ۲۳: ۹)

بعض اوقات صنعت رد العجز الی الصدر استعمال کی گئی ہے یعنی
پہلے مصرع کے آخری حصّہ کو دُوسرے مصرع کے شروع میں دُہرایا گیا ہے
اور اس میں کچھ ایزاد بھی کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔
جو تُم کو قبوُل کرتا ہے وہ مُجھے قبوُل کرتا ہے
جو مُجھے قبوُل کرتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو قبوُل کرتا ہے۔
(متیّ ۱۰: ۴۰)

بعض اوقات صنعتِ تمثیل کا استعمال ہُوا ہے اور سلیمان کے امثال

کے طرز پر امثال فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

جو تمہارے خلاف نہیں وہ تمہاری طرف ہے (لوقا ۹ : ۵۰)

تم زمین کے نمک ہو۔ (متی ۵ : ۱۳)

تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے (متی ۶ : ۲۴)

عبرانی کتب مقدسہ میں بہت سے فقرے ایسے ہیں جو اس طرز پر ڈھلے گئے ہیں۔

"نہ ۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ صفت انجیلوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو :-

فانی خوراک کے لئے محنت نہ کرو۔ بلکہ اس خوراک کے لئے جو ابدی زندگی کے لئے قائم رہتی ہے۔ (یوحنا ۶ : ۱۷)

چاروں انجیلوں میں ایسی آیات کی تعداد دو صد سے زیادہ ہے۔

بعض اوقات کلمۃ اللہ استعارہ اور تشبیہ کا استعمال فرماتے ہیں مثلاً

"اے یروشلیم کتنی ہی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں۔ مگر تم نے نہ چاہا"

بعض اوقات صنعت حسن تعلیل کا استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تم کو معاف کریگا۔ اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کرو گے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہارے قصور معاف نہ کریگا۔ (متی ۶ : ۱۴ - ۱۵)

اختصار مانع ہے ورنہ کلمۃ اللہ کا کلام معجز نظام مختلف صنائع اور بدائع سے پر ہے آپ کا کلام اس لحاظ سے ایک معجزہ ہے۔ اس میں ایک مقام بھی

ایسا نہ ملیگا جو بے جوڑ یا خامیٔ عبارت سے پُر ہو یا جس میں الم غلم بیر گٹھلی الفاظ حشو یہ بھرے ہوئے ہوں یا بے معنی تکرار ہو۔ یہ ایک بحر ذخار ہے جس میں سے گذشتہ دو ہزار سال سے غواصانِ بحرِ حقیقت نے نادر موتی نکالے ہیں۔ آپ کے ہر لفظ میں نکتہ ہے ہر فقرہ اعجازی ہے آپکا کلام فصاحت و بلاغت اور نظم و ترتیب کے لحاظ سے یگانۂ روزگار ہے۔

کلمۃ اللہ کا کلام ایسا تھا کہ جس نے ایک دفعہ سُن لیا وہ کبھی بھول نہ سکا کون شخص ہے جو اپنی زندگی میں مندرجہ بالا انجیلی فقروں میں سے کسی ایک کو سُن لے اور بھول سکے؟ فقرات ایسے برجستہ اور چست ہیں کہ فوراً ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسے پُر معنے ہیں کہ دُرّ نایاب ہیں اِس میں سادہ ترین الفاظ ایک لڑی میں پروئے گئے ہیں۔ اور اُن میں انتہا درجہ کا جوش اور اثر پیدا ہو گیا ہے! اُن کی عدیم المثال کامیابی اُن کے اثر ریز ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

(۶) کلمۃ اللہ کی جدّتِ طبع۔

کلمۃ اللہ کی جدّتِ طبع صرف اُسی سے ظاہر نہیں کہ آپ عوام الناس کو تعلیم دیتے تھے جن کو دیگر ربّی حقیر جانتے تھے آپ کی جدّت طبع آپ کی لاثانی اور بے نظیر طرز تعلیم پر ہی منحصر نہیں بلکہ اُس کا تمام انحصار آپ کی مخصوص تعلیم پر ہے۔ بعض مخالفین یہودی کتب سے آپ کی تعلیم کی نظیریں پیش کرتے ہیں مثلاً انجہانی مرزا صاحب قادیانی کہتے ہیں کہ مسیح نے یہودی کی کتب طالمود سے تعلیم چوری کر کے لوگوں پر ظاہر کیا کہ یہ میری تعلیم ہے (ضمیمہ انجام آتھم صـ۶) لیکن یہودی عالم ڈاکٹر مانٹی فیوری اِس امر کی نسبت لکھتا ہے کہ یہ نظیریں پیش نہیں کی جا سکتیں اور اِس کے دو سبب ہیں اوّل یہ کہ اِن یہودی

کتب کا ایک بہت بڑا حصہ پہلی صدی مسیحی کے بعد لکھا گیا جب انجیلیں لوگوں کے ہاتھوں میں موجود تھیں۔ دوم یہ کہ ان یہودی کتب کا اب تک کافی مطالعہ نہیں کیا گیا اور درحقیقت وہی نظیریں زیر بحث ہیں جو پیش کی جاتی ہیں"۔ پس جب یہودی کتب مابعد کے زمانہ میں تصنیف ہوئیں تو مقدم کلمتہ اللہ ٹھہرے۔ لیکن اگر ہم تقدیم و تاخیر کے سوال کو اُڑا دیں اور بفرضِ محال اگر مخالفین یہودی کتب سے نظیریں پیش بھی کر سکیں تو اس سے خداوند کی جدت پر حرف نہیں آسکتا کیونکہ اگر یہودی کتب کے انباروں کے انبار میں سے چند ایک فقرات دُرِّ نایاب کی طرح نکل بھی آئیں۔ تو وہ کلمتہ اللہ کی تعلیم کی درحقیقت کوئی نظیر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ فقرات ہزاروں ربیوں کی کتب کے انباروں میں سے نکالے جائینگے۔ لیکن صرف کلمتہ اللہ اکیلے معلم ہیں جن کے تمام اقوال اگر ایک جگہ جمع کئے جائیں تو مشکل پچاس صفحوں کے قریب ہونگے ان اقوال میں ایک فقرہ بھی ایسا نہیں ہے۔ جو دریائے معرفت کا دُرِّ نایاب نہ ہو۔ جرمن نقاد ولہاسن (WEllHAUSEN) کہتا ہے کہ "یہودی علما کا خیال ہے کہ مسیح کے اقوال طالمود میں پائے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن انجیل میں ان کے علاوہ بیسیوں اقوال ہیں جو طالمود میں نہیں ملتے۔ مسیح پہلا شخص تھا جس نے وہ کچھ کیا جو کسی نے نہ کیا تھا۔ اُس نے یہودی علمِ فقہ اور قیود شرعیہ کے کوڑا کرکٹ میں سے ازلی اصول دریافت کئے علاوہ ازیں متعدد اقوال ایسے بھی ہیں جو انجیل میں سے اخذ کر کے طالمود میں ڈال دئے گئے ہیں۔ اب وہ اقوال یہودی اقوال ہونے کا باطل دعویٰ کرتے ہیں۔"[۲] ربیوں کی تعلیم میں اخلاق کے گیہوں کے دانے موجود تھے۔ لیکن وہاں جھاڑیوں کے بے شمار کانٹے بھی تھے اور جھاڑیوں نے بڑھ کر گیہوں کے دانوں کو دبا لیا تھا۔ کلمتہ اللہ نے جھاڑیوں کو جمع کر کے

جلانے کے واسطے اِنکے گٹھے باندھ دیئے اور گیہوں کو کھتے میں جمع کرلیا۔

علاوہ ازیں خداوند مسیح کی طرفہ تعلیم کی جدّت صرف آپ کے مختلف اقوال میں ہی نہیں بلکہ سالم تعلیم میں ہے تعلیم کی نظیر تب ہی ثابت ہوسکتی ہے اگر ہم یہودی ربیّوں کی سالم تعلیم اور کلمتہ اللہ کی سالم تعلیم کو لیں اور اُن کا مقابلہ کرکے اُن کی نظیر ثابت کریں۔ لیکن یہ کوئی اِنسان نہیں کرسکتا کیونکہ یہودی ربیّوں کی تعلیم کی رُوح اور کلمتہ اللہ کی تعلیم کی رُوح میں بعد المشرقین ہے۔ دونوں کے زاویۂ نگاہ میں اِختلاف ہے۔ دونوں کی فضا الگ ہے۔ دونوں کی خصوصیات جُدا ہیں۔ آپ کے جاہل اور گنوار سامعین بھی بول اُٹھے کہ "وہ اِنکو فقیہوں کی طرح نہیں بلکہ صاحب اِختیار کی طرح تعلیم دیتا تھا" (مرقس ۱: ۲۲) اِن دونوں میں کسی طرح کا تعلق ہی نہیں تھا وہ بچپن سے فقیہوں کی تعلیم سُننے آئے تھے لیکن اِن کے کانوں نے کلمتہ اللہ کی سی تعلیم نہیں سُنی تھی۔ پس "سب لوگ حیران ہوئے"! اور کہنے لگے "یہ تو نئی تعلیم ہے" (مرقس ۱: ۲۷) کلمتہ اللہ کی تعلیم نہ فریسیوں کی سی تھی نہ صدوقیوں کی سی تھی آپ کے خیالات نہ قوم پرستوں کے سے تھے اور نہ ہیرودیسیوں کے سے تھے۔ آپ کے الفاظ میں نہ تو عہدِ عتیق کا عنصر غالب تھا اور نہ ان پر یونانیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ آپ نے اِخلاق کو ایک نئے اصل اصول پر قائم کیا تھا۔ آپ کی تعلیم نئی تھی اور اِس کا سبب بھی آپ نے بتا دیا۔ آپ نے فرمایا "میری تعلیم میری نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے کی ہے" (یوحنا ۷: ۱۶) پس ہر پہلو سے آپ کی طبع زاد تعلیم بے نظیر اور لاثانی ہے۔

(۷) کلمتہ اللہ اور دیگر مذاہب کے بانی:۔

کلمتہ اللہ کی تعلیم میں اور دیگر مذہبی پیشواؤں کی تعلیم میں ایک عظیم فرق یہ بھی ہے کہ دیگر انبیا اور مذہبی پیشوا اپنے مذاہب کے جزو لاینفک نہیں تھے۔ مثلاً اسلامی تعلیم کو معلوم کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ پیغمبر عرب کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔ خود رسول عربی نے اپنے اقوال اور الٰہی ارشادات میں تمیز کی ہے لیکن کلمتہ اللہ کی تعلیم کا یہ حال نہیں۔ کلمتہ اللہ کی زندگی، موت اور فتحیاب قیامت کے بغیر ہم آپ کی تعلیم کا مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ آپکی زندگی کے واقعات آپ کی تعلیم پر پوری روشنی ڈالتے ہیں اور خداوند کا کامل اور اکمل نمونہ اس تعلیم کی بہترین مثال ہے۔ پس کسی حالت میں بھی ہم آپ کی تعلیم کو آپ کی زندگی سے الگ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آپ کی زندگی میں تعلیم موجود ہے جس طرح آپ کی تعلیم میں زندگی موجود ہے یہ دونوں درحقیقت ایک ہی ہیں اور ایک کا دوسرے کے بغیر مطالعہ کرنا درحقیقت اس پہلو پر ظلم کرنا ہے۔ لیکن چونکہ اس رسالہ میں ہمارا موضوع صرف کلمتہ اللہ کی تعلیم ہے لہٰذا جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے ہم صرف آپ کی تعلیم کا ہی ذکر کرینگے ایک اور پہلو سے بھی مجرد تعلیم پر غور کرنا اس پر ظلم کرنا ہے۔ کلمتہ اللہ کے زریں اقوال مختلف موقعوں پر بولے گئے تھے۔ ان کی "شان نزول" کو نظرانداز کرکے ان کو ایک نظام میں منسلک کرکے مختلف عنوانوں کے تحت ان کا مطالعہ کرنے سے ان کا وہ لطف جاتا رہتا ہے جو سامعین کو حاصل ہوتا تھا۔ کلمتہ اللہ کا دل معرفت کا دریا تھا۔ آپ نے "دل کے اچھے خزانے سے اچھی چیزیں" نکالیں۔ (لوقا ۶: ۴۵) آپ کے اقوال بجلی کی کوند کی مانند ہیں جو بدی کی تاریکی

کو دُور کر کے اکنافِ عالم کو روشن کر دیتے ہیں لیکن اِن اقوال کو ایک ڈھانچہ میں ڈال کر ان کا مطالعہ کرنا ان پر ظلم کرنا ہے۔ آپ کا طرزِ تعلیم فلاسفہ کا سا نہ تھا۔ آپ نے دیدہ و دانستہ ایسی طرزِ تعلیم کو رد کر دیا جو فلاسفہ اور ربیوں کی تھی۔ وہ اپنے اقوال کو ایک نظام میں ڈھال کر مختلف عنوانوں کے تحت اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے۔ کلمۃ اللہ بھی اگر چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے لیکن آپ نے یہ طریقہ پسند نہ فرمایا۔ لیکن یہی طریقہ ہر مُصنّف کو مجبوراً استعمال کرنا پڑتا ہے۔ پس چونکہ ہم ایسا طریقہ استعمال کرتے ہیں جو کلمۃ اللہ نے دیدہ و دانستہ رد کر دیا تھا۔ قدرتاً ہم آپ کے الفاظ اور اقوال پر جبرِ عظیم کرتے ہیں جیسے کلمۃ اللہ کے الفاظ میں ہم "نئی مے کو پرانی مشکوں میں بھرتے ہیں۔ اور" کورے کپڑے کا پیوند پرانی پوشاک میں" لگاتے ہیں۔ (متی ۹: ۱۶-۱۷)

(۸) زمانۂ تعلیم

کلمۃ اللہ نے کہاں کس جگہ اور کب تعلیم دی؟ اِن سوالات کا تعلق زمان و مکان کے تقرر کے ساتھ ہے اور کُل علماء اس پر متفق نہیں۔ تاہم علماء کی ایک کثیر تعداد ذیل کی تاریخوں پر قریباً متفق ہے۔

۱۔ کلمۃ اللہ کا ظہورِ قدسی۔ یعنے سن پیدائش ۵ ق۔م

۲۔ کلمۃ اللہ کا اِصطباغ پانا۔ موسم گرما ۲۶ء

۳۔ کلمۃ اللہ کی خدمت کے اِبتدائی واقعات۔ یعنی یوحنا اِصطباغی کی آمد سے لیکر یروشلیم میں وردِ مسعود تک۔ از موسم گرما ۲۶ء تا روزِ عیدِ فسح ۱۱ اپریل ۲۷ء

۴- یہودیہ میں ابتدائی خدمت - یعنے یروشلیم میں وارد ہونے سے لے کر گلیل میں مراجعت فرمانے تک - از روز عیدِ فسح ۱۱ اپریل ۲۷ء تا دسمبر ۲۷ء

۵- گلیلی خدمت کا پہلا دور - یعنے گلیل میں مراجعت کرنے سے لے کر بارہ حوارئین کے انتخاب تک - از دسمبر ۲۷ء تا ابتدائے موسم گرما ۲۸ء

۶- گلیلی خدمت کا دور - یعنے حوارئین کے انتخاب سے لیکر شمالی گلیل میں خلوت گزین ہونے تک از ابتدائے موسم گرما ۲۸ء تا روزِ عیدِ فسح ۱۸ اپریل ۲۹ء

۷- گلیلی خدمت کا تیسرا دور - یعنے شمالی گلیل میں خلوت گزین ہونے سے لے کر یروشلیم کی طرف روانہ ہونے تک - از روزِ عیدِ فسح ۱۸ اپریل ۲۹ء تا نومبر ۲۹ء

۸- پیریا میں خدمت - یعنے گلیل سے آخری دفعہ روانہ ہونے سے لے کر یروشلیم میں آخری دفعہ وارد ہونے تک - از نومبر ۲۹ء تا عیدِ فسح سے پہلا اتوار مطابق ۲ اپریل ۳۰ء

۹- مقدس ہفتہ - یعنے یروشلیم میں وارد ہونے سے لے کر ظفریاب قیامت تک - از اتوار ۲ اپریل تا اتوار ۹ اپریل ۳۰ء

۱۰- آخری چالیس ایّام - یعنی کلمۃ اللہ کی ظفریاب قیامت سے لے کر صعودِ آسمانی تک - از اتوار ۹ اپریل تا جمعرات ۱۸ مئی ۳۰ء

مندرجہ بالا واقعات اناجیل اربعہ میں ذیل کے مقامات میں درج ہیں

اوّل۔ کلمۃ اللہ کا ظہورِ قدسی:۔

(ا) تمہید۔ متی ۱:۱-۱۷+ لوقا ۱:۱-۴ و ۳: ۲۳-۳۸+
یوحنا ۱:۱-۱۸+

(ب) فرشتہ کا آنا۔ لوقا ۱:۵-۵۶+ متی ۱:۱۸-۲۵

(ج) پیدائش۔ متی ۱:۱۸-۲۵+ لوقا ۱:۵۷ تا ۲: ۲۰+

(د) طفولیت۔ متی ۲:۱-۲۳+ لوقا ۲: ۲۱-۳۹+

(ہ) ناصرت کی زندگی۔ لوقا ۲: ۳۹-۵۲+

دوم:۔ کلمۃ اللہ کا اصطباغ پانا:۔

متی ۳:۱ تا ۴: ۱۱+ مرقس ۱:۱-۱۳+ لوقا ۳: ۱ تا ۴: ۱۳+

سوم۔ کلمۃ اللہ کی خدمت کے ابتدائی واقعات

یوحنا ۱: ۱۹ تا ۲: ۱۲+

چہارم۔ یہودیہ میں ابتدائی خدمت

(ا) یروشلیم میں مسیح کے کام کی ابتدا۔ یوحنا ۲: ۱۳ تا
۳: ۲۱+

(ب) یہودیہ میں منادی اور بپتسمے۔ یوحنا ۳: ۲۲-۳۶+

(ج) سامریہ میں دو دِن کی خدمت۔ متی ۴: ۱۲۔ مرقس ۱:۱۴
یوحنا ۴: ۱-۴۲+

پنجم ۔ گلیلی خدمت کا پہلا دور

(ا) گلیلی خدمت کی ابتدا ۔ متّی ۴: ۱۲ - ۱۷ + مرقس ۱: ۱۴ - ۱۵ +
لوقا ۴: ۱۴ - ۳۱ + یوحنا ۴: ۴۳ - ۴۵

(ب) چار حواریوں کی بلاہٹ اور پہلا مشنری سفر ۔ متّی ۴: ۱۸ - ۲۳
و ۸: ۱ - ۴ و ۱۴ - ۱۷ + مرقس ۱: ۱۶ - ۴۵ + لوقا ۴:
۳۱ - ۴۴ و ۵: ۱ - ۱۶

(ج) فقیہوں اور فریسیوں کی دشمنی ۔ متّی ۹: ۱ - ۱۷ و ۱۲: ۱ -
۱۴ و مرقس ۲: ۱ + ۳: ۶ +

ششم ۔ گلیلی خدمت کا دوسرا دور ۔

(ا) بادشاہت کی تنظیم ۔ متّی ۴: ۲۳ تا ۸: ۱ + ۱۰: ۲ - ۴ و ۱۲: ۱۵ - ۲۱ -
مرقس ۳: ۷ - ۱۹ + لوقا ۶: ۱۷ - ۴۹ +

(ب) دوسرا مشنری سفر ۔ متّی ۸: ۵ - ۱۳ و ۱۱: ۲ - ۳۰ + لوقا ۷:
۱ تا ۸: ۳ +

(ج) گلیل کی جھیل کے کنارے تعلیم ۔ متّی ۱۲: ۲۲ تا ۱۳: ۵۳ +
مرقس ۳: ۱۹ تا ۴: ۳۴ + لوقا ۸: ۴ - ۲۱ +

(د) جھیل کے کنارے کے معجزات ۔ متّی ۸: ۲۳ تا ۹: ۳۴ + مرقس
۴: ۳۵ تا ۵: ۴۳ - لوقا ۸: ۲۲ تا ۵۱ +

(ہ) تیسرا مشنری سفر ۔ متّی ۹: ۳۵ تا ۱۱: ۱ و ۱۳: ۵۴ - ۵۸
۱۴: ۱ - ۱۲ + مرقس ۶: ۱ - ۲۹ + لوقا ۹: ۱ - ۷ +

(ہ) کفرنحوم کے واقعات۔ متّی ۱۴: ۱۳ تا ۱۵: ۲۰+ مرقس ۶: ۳۰ تا ۷: ۲۳+ لُوقا ۹: ۱۰-۱۷+ یُوحنّا ۶: ۱-۷۱+

ہفتم۔ گلیلی خدمت کا تیسرا دور

(ا) خلوت گزینی کے لیے پہلا سفر۔ متّی ۱۵: ۲۱-۳۱- مرقس ۷: ۲۴-۳۷+

(ب) گلیل کی جھیل کو واپسی۔ متّی ۱۵: ۳۲ تا ۱۶: ۱۲+ مرقس ۸: ۱-۲۶+

(ج) خلوت گزینی کے لیے دُوسرا سفر۔ متّی ۱۶: ۱۳ تا ۱۷: ۲۳- مرقس ۸: ۲۷ تا ۹: ۳۲+ لُوقا ۹: ۱۸-۴۵+

(د) کفرنحوم میں آمد۔ متّی ۱۷: ۲۴-۲۷ و ۱۸ باب+ مرقس ۹: ۳۳-۵۰+ لُوقا ۹: ۴۶-۵۰+

(ہ) یروشلیم میں موسم خزاں میں آمد۔ یُوحنّا ۷: ۱ تا ۸: ۵۹+

ہشتم۔ پیریا میں خدمت:۔

(ا) گلیل سے روانگی کے وقت سے لے کر عید تک متّی ۸: ۱۸-۲۲ و ۱۹: ۱-۲- مرقس ۱۰: ۱+ لُوقا ۹: ۵۱ تا ۱۰: ۴۲ و یُوحنّا ۹: ۱ تا ۱۰: ۴۲-

(ب) عید کے وقت سے افرائیم میں خلوت گزینی تک۔ لُوقا ۱۱: ۱تا ۱۷: ۱۰ و یُوحنّا ۱۱: ۱-۵۴+

(ج) افرائیم سے خلوت گزینی سے لے کر یروشلیم میں وارد ہونے

تک - متّی ۱۹: ۳ تا ۲۰: ۳۴ و ۲۶: ۶-۱۳+ مرقس ۱۰: ۲ تا ۵۲ و ۱۴: ۳-۹ + لوقا ۱۷: ۱۱ تا ۱۹: ۲۸+ یوحنّا ۱۱: ۵۵ تا ۱۲: ۱۱+

نہم - مقدّس ہفتہ :-

یک شنبہ - متّی ۲۱: ۱-۱۱ و مرقس ۱۱: ۱-۱۱ و لوقا ۱۹: ۲۹-۴۴ و یوحنّا ۱۲: ۱۲-۱۹-

دوشنبہ - متّی ۲۱: ۱۲-۲۲+ مرقس ۱۱: ۱۲-۱۹+

لوقا ۱۹: ۴۵-۴۸+

سہ شنبہ - متّی ۲۱: ۲۰ تا ۲۶: ۱۶+ مرقس ۱۱: ۲۰ تا ۱۴: ۱۱+ لوقا ۲۰: ۱ تا ۲۲: ۶+ یوحنا ۱۲: ۲۰-۵۰+

چہار شنبہ -

پنج شنبہ - متّی ۲۶: ۱۷ تا ۳۵- مرقس ۱۴: ۱۲-۳۱- لوقا ۲۲: ۷-۳۸+ یوحنّا ۱۳ باب تا آخر ۱۷ باب+

جمعہ - متّی ۲۶: ۳۶ تا ۲۷: ۶۱+ مرقس ۱۴: ۳۲ تا ۱۵: ۴۷- لوقا ۲۲: ۳۹ تا ۲۳: ۵۶- یوحنّا ۱۸: ۱ تا ۱۹: ۴۲+

شنبہ - متّی ۲۷: ۶۲-۶۶+

دہم - آخری چالیس ایّام :-

(ا) مسیح کی ظفریاب قیامت - متّی ۲۸: ۱-۱۵- مرقس ۱۶: ۱-۱۴ لوقا ۲۳: ۵۶ تا ۲۴: ۳۴+ یوحنّا ۲۰: ۱-۲۵+

(ب) خداوند کا شاگردوں کو دوبارہ دکھائی دینا اور صعودِ آسمانی

یُوحنا ۲۰: ۲۶ تا ۲۱: ۲۴+ متی ۲۸: ۱۶-۲۰+ مرقس ۱۶: ۱۵-۲۰+ لُوقا ۲۴: ۴۴-۵۳+

ج- تتمّہ- یُوحنّا ۲۰: ۳۰ و ۳۱ و ۲۱: ۲۵-

بابِ اوّل

حقوق اللہ

فصل اوّل - تعلیمِ مسیح دربارۂ ذاتِ الٰہی

(۱)

اہل یہود کے لئے احکامِ عشرہ میں پہلا حکم یہ تھا۔ "کہ میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا" (خروج ۲۰: ۳) اوائل زمانہ میں اہلِ یہود اِس حکم کا مطلب یہ سمجھے کہ اِس حکم سے دیگر اقوام و ممالک کے معبودوں کی عبادت ممنوع ہے لیکن اُن کے وجود کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ جس طرح اُن کا معبود یہوواہ حقیقی وجود رکھتا ہے اور اُن کی قوم یہود پر حکمران ہے اسی طرح دیگر ممالک کے معبود حقیقی وجود رکھتے ہیں۔ اور اُن اقوام پر حکمران ہیں جو ان کی پرستش کرتی ہیں صرف اہلِ یہود کو ان غیر معبودوں کی پرستش سے منع کیا گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح ان کے معبود "یہوواہ" نے اُن کو ملکِ کنعان کی سرزمین عطا کی ہے اسی طرح

دیگر ممالک کے معبودوں نے اپنی اقوام کو اُنکے ممالک عطا کئے ہیں۔ معبودوں کی حکمرانی اُن کے پرستاروں کے مُلک کی سرحد تک محدُود سمجھی جاتی تھی۔ لہذا ایک ملک کے معبُود کی پرستش اُس کے حدُود کے باہر دُوسرے ملک کی سرزمین میں نہیں ہو سکتی تھی (قاضی ۱۱: ۲۴ + ا سموئیل ۲۶: ۱۹ + ۲ سلاطین ۵: ۱۸ وغیرہ)

خُداوند مسیح سے آٹھ صدیاں پیشتر انبیائے عظام مثلاً یسعیاہ۔ ہوسیع عاموس اور میکاہ نے اہلِ یہُود کو یہ تعلیم دی تھی کہ اُن کا خُدا یہوواہ اکیلا واحد حقیقی برحق اور لاشریک خُدا ہے اور تمام بُت اور دیگر ممالک کے معبُود باطل ہیں جو کوئی ہستی نہیں رکھتے۔ یہوواہ دانائے مطلق اور حاضر و ناظر خالقِ کون و مکان ہے جو اپنی خلقت کا پروردگار ہے وہ قادرِ مطلق لا محدُود ازلی الرحمٰن الرحیم ہے۔ جو ہمارے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ چند ایک مقامات میں خُدا کو باپ کا نام بھی دیا گیا ہے (زبُور ۶۸: ۵ آیت + ملاکی ۱: ۶ و ۲: ۱۰)۔

اہلِ یہُود خُدا کے نام یہوواہ کو اسمِ اعظم اور مُقدس ترین نام خیال کرتے تھے۔ "یہوواہ" نام مُنہ سے نکالنے سے ڈرتے تھے۔ لہذا وہ اس نام کا بہت کم استعمال کرتے تھے۔ پس اُن میں خُدا کے لئے چند دیگر نام مروّج تھے۔ خُدا کو عموماً "ستودہ" (مرقس ۱۴: ۶۱) یا حق تعالےٰ (زبُور ۹۱: ۱) یا "آسمان" (یُوحنّا ۳: ۲۷) یا محض "نام" یا "قُدرت" (مرقس ۱۴: ۶۲) کے ناموں سے خطاب کیا جاتا تھا۔

یہُودی ربیوں نے خُدا کی ہستی کو ایسا بلند و بالا اور بعید بنا دیا تھا۔ کہ خُدا اور اُس کی خلقت میں ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ خُداوند مسیح نے اُس

خلیج کو مٹا دیا اور یہ تعلیم دی کہ گو خدا انسان سے بلند و بالا ہے تاہم وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی ذات ہی محبت ہے۔ گو خداوند مسیح خدا کی بادشاہت کی منادی کرتے تھے تاہم آپ نے خدا کا تصور سیاسی اور پولٹیکل حلقوں سے اخذ نہ کیا۔ آپ نے خدا کو کبھی بادشاہ نہ کہا۔ آپ کے نزدیک خدا کوئی سلیمان بادشاہ کی طرح نہ تھا جو اپنی ساری شان و شوکت سے آسمانی تخت پر بیٹھا ہے۔ آپ نے خدا کے تصور کو خاندانی زندگی سے اخذ کیا۔ آپ کی تعلیم کے رگ و ریشہ میں خدا کی محبت کا تصور موجود ہے۔ خدا کے واسطے "باپ" کا نام آپ کو نہایت محبوب تھا چنانچہ آپ ہمیشہ خدا کو "باپ" (متی ۱۱: ۲۵ + مرقس ۱۳: ۳۲) وغیرہ "میرا باپ" (متی ۷: ۲۱ + ۱۰: ۳۲ + لوقا ۲: ۴۹ + متی ۱۶: ۱۷ + ۱۸: ۱۰ + ۲۶: ۴۲ وغیرہ) "میرا آسمانی باپ" (متی ۱۸: ۳۵) "ہمارا باپ" (متی ۶: ۹) کے نام سے پکارا کرتے تھے چنانچہ صرف "پہاڑی وعظ" میں یہ خطاب ۱۷ دفعہ وارد ہوا ہے۔ خداوند کی زبان معجز بیان پر یہ لفظ نہایت مطلب خیز ہو جاتا ہے اور ایسے معنی اختیار کر لیتا ہے جو انبیائے سابقین کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے تھے۔ جس طرح عہد عتیق میں خدا کے لئے لفظ "یہوواہ" خاص نام ہے اسی طرح اناجیل اربعہ میں خدا کے لئے لفظ "باپ" خاص طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس لفظ کے ذریعہ ذات الٰہی کا ایک نیا انکشاف ہم پر ہوا ہے اور یہ انکشاف ذاتِ الٰہی کا کامل اور اکمل مکاشفہ ہے +

خداوند مسیح کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا کی ذات محبت ہے باقی تمام صفات اس اصول کے تحت کر دی گئی ہیں اگر خدائے قادر مطلق اور اکبر و علیم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محبت قادر و اکبر اور علیم ہے جو تمام شیطانی روکاوٹوں پر غالب آتی ہے (متی ۱۰: ۲۸-۳۱) اگر خدا لامحدود اور

ازلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی محبّت لامحدود اور ازلی ہے اگر خُدا وفادار ہے تو اُس کی محبّت وفادار اور لازوال ہے اگر خُدا حاضر وناظر ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اُس کی محبّت ہر جگہ حاضر وناظر ہے اگر وہ کامل ہے تو اس کی محبّت کامل ہے اگر خُدا الرحمٰن الرحیم۔ کریم غفار اور شفقت میں غنی ہے تو محض اپنی محبّت کی وجہ سے ہے اگر خُدا غیور ہے تو اُس کی غیرت محبّت کی وجہ سے جوش زن ہے حتیٰ کہ خُدا کا غضب بھی آتشِ محبّت کی چنگاریاں ہیں پس جب خُدا محبّت ہے تو ہمارا بھی مُقدّم اور اوّلین فرض یہ ہے کہ ہم خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبّت رکھیں۔ (مرقس ۱۲: ۳۰)

کلمۃ اللہ نے خُدا کی ذات کی نسبت ایک امر ہم پر ظاہر فرمایا ہے۔ جو زمانہ سلف میں لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ آپ نے تعلیم دی ہے کہ محبّت کا جوہر ایثار ہے چونکہ خُدا بنی نوع انسان کو پیار کرتا ہے اس لئے اُس کی محبّت ہر طرح کا ایثار کرنے کے لئے تیار ہے" خُدا نے دُنیا سے ایسی محبّت رکھی کہ اُس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اُس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے۔ کیونکہ خُدا نے بیٹے کو دُنیا میں اس لئے بھیجا ہے کہ دُنیا اُس کے وسیلے سے نجات پائے" (یوحنّا ۳: ۱۶-۱۷) چونکہ ابن اللہ مجسّم محبّت تھے لہذا ضرور ہوا کہ آپ دُکھ اور اذیّت اُٹھائیں۔ (یوحنّا ۱۵: ۱۳) آپ بار بار شاگردوں کو تاکید کر کے سمجھاتے تھے (مرقس ۸: ۳۲) کہ "ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دُکھ اُٹھائے اور وہ قتل کیا جائے (مرقس ۸: ۳۱) آپ نے پھر فرمایا۔ کہ "ابن آدم آدمیوں کے ہاتھ میں حوالہ کیا جائے گا۔ اور وہ اُسے قتل کرینگے"۔ (متی ۱۷: ۲۲) پھر سہ بارہ فرمایا "دیکھو ہم یروشلیم کو جاتے

ہیں اور ابنِ آدم سردار کاہنوں اور فقیہوں کے حوالے کیا جائیگا۔ اور وہ اُس کے قتل کا حکم دیں گے اور اُسے غیر قوموں کے حوالے کریں گے تاکہ وہ اُسے ٹھٹھوں میں اُڑائیں اور کوڑے ماریں اور صلیب پر چڑھائیں"۔ (متی ۲۰: ۱۸ + لوقا ۱۸: ۳۱-۳۳) پھر تاکید کے آپ نے اپنے شاگردوں کو فرمایا کہ "تمہارے کانوں میں یہ باتیں پڑی رہیں۔ کیونکہ ابنِ آدم آدمیوں کے ہاتھ میں حوالے کئے جانے کو ہے"۔ (لوقا ۹: ۴۴) لیکن حواریوں نے "ان میں سے کوئی بات نہ سمجھی اور یہ قول ان پر پوشیدہ رہا اور ان باتوں کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آیا"۔ (لوقا ۱۸: ۳۴) ان کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ خدا کے پیارے مسیح موعود کے تصور کے ساتھ دُکھ اور اذیت اور صلیب اور قتل کو متعلق کریں۔ خدا تعالٰے کا بیٹا اور صلیب! پس ایک شاگرد پطرس کلمۃ اللہ کو "الگ لے جاکر اُسے ملامت کرنے لگا۔ مگر اُس نے پھر کے اور اپنے شاگردوں پر نگاہ کر کے پطرس کو ملامت کی اور کہا اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو کیونکہ تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے"۔ (مرقس ۸: ۳۲-۳۳) کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ "آدمیوں کا خیال" یہ ہے کہ خدا کی محبت کا انسانی دُکھ اور اذیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لیکن الٰہی خیال اس کے بالکل برعکس ہے۔ خدا کی محبت دُکھ اور اذیت سے نہیں کتراتی بلکہ اُس کا جلوہ اور ظہور ایثار میں ہوتا ہے۔ صلیب کی راہ "خدا کی باتوں" کی راہ ہے۔ صلیب خدا کی محبت کا بہترین مکاشفہ ہے اور اس کٹھن راہ کو اختیار کر کے ابن اللہ نے آسمانی باپ کی محبت مکاشفہ بنی نوع انسان پر ظاہر کیا ہے +

قیصریہ فلپی وہ جگہ تھی جہاں کلمۃ اللہ نے اِس حقیقت کو اپنے شاگردوں

ظاہر فرمایا۔ اس جگہ ایک غار تھا جہاں یونانی لوگ زمانہ سلف میں پین دیوتا (PAN) کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اِس جگہ ہیرودیس نے قیصر اگسطس کی آمد کے بعد ایک مندر بھی بنوایا تھا۔ جہاں قیصر پرستی ہوتی تھی۔ پس یہ غار یونانیوں اور رومیوں کے مذاہب کی شان و شوکت۔ صولت و سطوت اور جاہ و جلال کا ایک نمونہ تھا۔ اور اسی جگہ جہاں ان مذاہب باطلہ کا عَلم لہراتا تھا کلمتہ اللہ نے وہ تعلیم دی جو ان مذاہب کے بالکل برعکس تھی وہاں کلمتہ اللہ نے حقیر صلیب کو الہیٰ محبّت کا اعلیٰ ترین منظر پیش کیا۔

آپ کے مطابق خُدا ایک پُرمحبّت ہستی ہے۔ جس کی محبّت ان تمام لوگوں کو تلاش کرتی ہے جو اُس سے منحرف اور برگشتہ ہو گئے ہیں اُن کو دوبارہ اپنے پاس لانے میں ہر طرح کا ایثار کرنے کو تیار ہے +

اِس حقیقت کی ایک جھلک یہودی انبیائے سلف کو ملی تھی اور اُنہوں نے اُس کو دھندلی طور پہ لوگوں تک پہنچایا تھا۔ (یسعیاہ ۵۳ باب) لیکن یہ صداقت صرف ابن اللہ کے ذریعہ بنی نوع انسان پر مثل نیم روز کی طرح روشن ہو گئی ہے۔ خُداوند کی زبانِ حقائق ترجمان نے یہ تعلیم دی ہے کہ صلیب درحقیقت الہیٰ جلال و عظمت کا پرتو ہے۔ صلیب کے جانکاہ سانحہ نے حواریوں کی آنکھیں کھولیں اور جو شے پہلے اُن کے خیال میں اِنتہائی ذلّت کا نشان تھی وہ الہیٰ محبّت کا نشان ہو گئی۔ ابن اللہ نے اپنی زندگی اور موت سے خُدا کی محبّت کا اِظہار لوگوں پر کر دیا۔

خُداوند مسیح نے ہم کو تعلیم دی ہے کہ خُدا باپ ایک واحد شخصیّت رکھنے والی ہستی ہے۔ جو ہم سے محبّت رکھتا ہے۔ اُس سے یہ مراد نہیں کہ خُدا دیگر انسانوں کی طرح ایک شخص ہے۔ یا خُدا انسان کی صورت پر ہے۔ بلکہ

اِس کا مطلب یہ ہے کہ گو خُدا اپنی خلقت سے بلند و بالا ہے اور اُس کی ذات بعید از فہم و ادراک ہے تاہم جب اُس کا تصور باندھتے ہیں تو اُس کی صورت ہم کو دیگر انبیائے فطرت کی نسبت اِنسان میں بہترین طور پر دکھائی دیتی ہے اِنسان "خُدا کی صورت" پر پیدا کیا گیا ہے (پیدائش ۱: ۲۷) پس خُدا کو بہترین اِنسانوں سے بھی بدرجہا بہتر ہونا چاہیئے اور شخصیت کی اعلیٰ ترین صفات کو بدرجہ احسن و اکمل خُدا میں موجود ہونا چاہیئے پس اِس میں عقل اور ارادہ اور محبت کامل درجہ میں موجود ہونا چاہیئے۔ کلمتہ اللہ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ خُدا ہمارا باپ ہے جو ہم سے محبت رکھتا ہے اور اُس کا ارادہ یہ ہے کہ اِنسان بھی اُس کے ساتھ محبت کا رشتہ پیدا کرے۔ لہٰذا گنہگاروں کو بچانے کی خاطر اُس نے اپنے ابن کو دُنیا میں بھیجا تاکہ وہ خُدا کی محبت کا مکاشفہ گنہگار دُنیا پر ظاہر کرے۔

(۲)

ملاکی کی کتاب کے مصنف کے نزدیک خُدا ہمارا "باپ" ہے کیونکہ اُس نے ہم کو خلق کیا ہے (۲: ۱۰) لیکن کلمتہ اللہ کے نزدیک خُدا محض خالق ہونے کی وجہ سے ہمارا باپ نہیں ہے آپ کی تعلیم میں خُدا کے خالق ہونے پر زور نہیں دیا گیا۔ گو آپ خُدا کو خالق مانتے تھے (مرقس ۱۰: ۶) تاہم آپ نے کبھی اپنی زبانِ حقیقت ترجمان سے خُدا کو خالق کے نام سے یاد نہیں کیا۔

زبور نویس یہوواہ کو اس عہد کی وجہ سے "باپ" کہتا ہے جو خُدا اور اُس کی برگزیدہ قوم اِسرائیل میں تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ چونکہ خُدا نے اہل یہود کو اقوام عالم میں سے چن لیا ہے لہٰذا وہ اِس برگزیدہ قوم کا "اِس لحاظ سے باپ ہے" وہ اِس لحاظ مختلف افراد کا "باپ" نہیں تھا بلکہ کُل قوم اِسرائیل کا "باپ" تھا۔ یہ "باپ"

سے اہلِ یہود کی مراد یہ تھی کہ صرف اہلِ یہود ہی خدا کے منظورِ نظر ہیں چنانچہ یہود کہتے تھے کہ "جب ہمارا باپ ابراہیم پیدا نہیں ہوا تھا تب خدا صرف آسمان کا بادشاہ تھا لیکن جب ابراہیم پیدا ہوا تو اُس نے خدا کو آسمان اور زمین دونوں کا بادشاہ بنا دیا۔"[۲]

لیکن اناجیل سے مذکورہ بالا دونوں تصوّر کلیتہً غائب ہیں۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم کے مطابق خدا ہمارا باپ ہے کیونکہ وہ ہم سے محبّت کرتا ہے۔ خدا کی محبّت کسی خاص قوم، ملک وملّت یا فرد تک محدود نہیں بلکہ وہ تمام دُنیا پر بلا امتیاز نسل حاوی ہے نہ تو اسرائیل کی قوم اور نہ اُس قوم کا کوئی خاص فرد خدا کا خاص منظورِ نظر ہے بلکہ اقوامِ عالم اُس کی مطمحِ محبّت ہیں۔ خدا ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زمانہ کے ہر فرد بشر کے ساتھ کامل محبّت رکھتا ہے گو مختلف افراد اپنے گناہوں کے باعث خدا سے دُور بھٹک کر فرزندیت کے رشتہ کی طرف سے لاپرواہ ہو گئے ہوں۔ لیکن اُس کی محبّت ان کو فراموش نہیں کرتی۔ گو انسان اپنی معصیت کی وجہ سے ابنیّت کے رشتہ کو توڑ دے لیکن الٰہی محبّت ہمیشہ یکساں رہتی ہے کیونکہ وہ ازلی اور ابدی محبّت ہے۔ خدا تمام بنی نوع انسان کے ہر فرد کا باپ ہے لیکن افراد کو لازم ہے کہ اس محبّت کے رشتہ کو جو اُن کے گناہوں نے منقطع کر دیا تھا از سرِنو توبہ کے وسیلے قائم کر کے خدا کے فرزند بن جائیں۔ جو اشخاص اس طریقہ سے خدا باپ کی طرف رجوع نہیں کرتے وہ اپنی ابنیّت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ اِس لائق نہیں رہتے کہ خدا کے بیٹے کہلائیں۔ (لوقا ۱۵: ۱۹) لیکن جو اشخاص خدا کی لازوال محبّت کو جان بوجھ کر نہیں ٹھکراتے بلکہ اُس کو قبول کرتے ہیں۔ وہ از سرِنو خدا کے فرزند بننے کے حقدار ہو جاتے ہیں (یوحنا ۱: ۱۲)

جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ خدا کی عالمگیر ابوّت کا تصوّر ربنا المسیح کی تعلیم کا

بنیادی عنصر ہے اور یہ تصور تمام ادیانِ عالم بالخصوص اسلام میں کالنادر فی المعدوم کا حکم رکھتا ہے۔ اسلام میں خدا کے ننانویں نام ہیں۔ لیکن ان اسمائے حسنہ میں "آب" "باپ" کا نام موجود نہیں اور نہ اُس لفظ کا پاکیزہ اور لطیف مفہوم کسی اور نام سے قرآن میں موجود ہے "آب" یا "رب" یہ دو تصور ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ پہلا تصور مسیحی ہے اور دوسرا اسلامی ہے جو اسلام کی طبیعت اور شیوہ کے مطابق بھی ہے چنانچہ ڈاکٹر عبداللہ ایڈیٹر ترکی اخبار اجتہاد اگست ۱۹۲۳ء کی اشاعت میں لکھتا ہے "انتقام پسند عربوں سے یہی اُمید کی جاسکتی تھی کہ اُن کا اللہ قادرِ مطلق اور انتقام پسند ہوتا۔ لیکن میرا ایسے خدا پر ایمان ہے جو بالکل نیک ہے مجھے ایسے خدا کی ضرورت ہے جو مصیبت زدوں کے ساتھ دُکھ اور مصیبت کے وقت روئے۔ عربوں نے جبریہ اپنے خودساختہ اللہ کو ہمارے گلے مڑھ دیا ہے اور ہم کو تباہ کر دیا ہے"۔

(۳) خدا کی پروردگاری۔

کلمتہ اللہ کی تعلیم کے مطابق خدا ہمارا باپ ہے کیونکہ وہ ہماری پرواکرتا ہے۔ وہ ہم سب کا پروردگار ہے۔ منجیٔ عالمین نے فرمایا ہے کہ "اپنی جان کا فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ پوشاک کے لئے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں وہ نہ محنت کرتے اور نہ کاتتے ہیں۔ تو بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان وشوکت کے ان میں

کسی کی مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی۔ ایسی پوشاک پہناتا ہے۔ تو اے کم اعتقادو تم کو کیوں نہ پہنائیگا؟ اس لیے فکر مند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے۔ اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو۔ جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔" (متی ۶ باب)

خدا کی محبت کی وجہ سے اُس کی پروردگاری لامحدود ہے۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا۔ "کیا پیسے کی دو چڑیاں نہیں بکتیں؟ ان میں سے ایک بھی تمہارے باپ کی مرضی بغیر زمین پر نہیں گر سکتی۔ بلکہ تمہارے سر کے بال بھی سب گنے ہوئے ہیں۔ پس ڈرو نہیں۔ تمہاری قدر تو بہت سی چڑیوں سے زیادہ ہے۔" (متی ۱۰: ۲۹-۳۱) پس روز فردا کی بابت فکر کرنا خدا کی پروردگاری پر شک لانا ہے۔ کلمۃ اللہ کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تن آسانی اختیار کر کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہیں۔ بلکہ آپ کا مدعا یہ ہے کہ ہم روزی حاصل کریں لیکن ہر وقت روزی کے فکر میں ہلکان و غلطان نہ رہیں۔ کیونکہ "ہمارا آسمانی باپ" جانتا ہے کہ ہم "ان سب چیزوں کے محتاج" ہیں۔ (لوقا ۱۲: ۳۰) خدا کی لامحدود محبت اور پروردگاری کے سامنے ہماری فکر کیا حقیقت رکھ سکتی ہے؟ "تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ پس جب سب سے چھوٹی بات نہیں کر سکتے تو باقی چیزوں کا کیوں فکر کرتے ہو۔" (لوقا ۱۲: ۲۵-۲۶) پس لازم ہے کہ ہم فکریں آسمانی باپ پر ڈال دیں۔ کیونکہ اُس کو اپنی بے زوال محبت کی وجہ سے ہماری فکر ہے۔

خداوند مسیح نے یہ تعلیم بھی دی ہے کہ ہمارے آسمانی باپ کی محبت

کُل کائنات پر قادر ہے اور وہ اپنے ازلی ارادوں کو باوجود رکاوٹوں کے پورا کر کے چھوڑیگا۔ خدا ربّ العالمین ہے اور فطرت اُس کے ازلی ارادوں کے ماتحت ہے وہ "آسمان اور زمین کا خداوند" ہے۔ (متی ۱۱: ۲۵) اگو بظاہر ہم کو خدا کے ارادے کامیاب ہوتے نظر نہ آئیں لیکن وہ اس بات پر قادر ہے کہ اُس کی مرضی "جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو"۔ (متی ۶: ۱۰) کائنات کے کل قوانین اور طریقے اُس کے ارادوں کو بر اقتضائے وقت پورا کرینگے اور خدا کی محبّت تمام امور پر فاتح ہوگی۔ وہ جو "آسمان کا خداوند" ہے بالآخر فی الواقع "زمین کا خداوند" بھی ہو کر رہیگا اور اس کے پُرمحبّت ارادے جو وہ مسیح میں بنی نوعِ انسان کے لیئے رکھتا ہے غالب ہو کر رہیں گے۔

فصل دوم

(۱)

ایمان:۔

پس اگر ہم ایسے پُرمحبّت خدا پر ایمان رکھیں گے تو ہمیں "کسی طرح کی کمی نہ ہوگی"۔ (زبور ۲۳: ۱) لیکن ہمارا ایمان محض زبانی جمع خرچ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ ہمارا ایمان دلی وثوق کے ساتھ ہونا چاہیئے اگر ہم خدا پر پکا ایمان رکھیں گے تو ہماری تمام مشکلات حل ہو جائیں گی اور ہماری نظر میں کوئی شے ناممکن نہ رہے گی۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ "جو اعتقاد رکھتا ہے اُس کے لیئے سب کچھ ہو سکتا ہے"۔ (مرقس ۹: ۲۳) آپ ہر شخص کو جو آپ کے

یا اس شفا پانے یا کسی اور غرض کے لئے حاضر ہوتا فرماتے "خدا پر ایمان رکھو" (مرقس ۱۱: ۲۲ + متی ۴: ۴۰ + ۱۳: ۸ وغیرہ) اور فرماتے کہ خدا سے دعا کرو تا کہ وہ تم کو ایمان کی توفیق عطا کرے اور تمہاری بے اعتقادی کا چارہ کرے۔ (مرقس ۹: ۲۴ + لوقا ۱۷: ۵) کلمتہ اللہ کے نزدیک "ایمان" کسی عقیدہ کا مترادف نہ تھا جو فلسفیانہ دلائل کا محتاج ہو۔ آپ کے خیال کے مطابق ایمان اس روحانی جذبہ کا نام ہے جس سے ہم خدا کو "اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت" سے اپنا مالک خداوند اور باپ مانتے ہیں اس روحانی حالت کا تعلق نہ فلسفہ اور استدلال سے ہے اور نہ عقاید سے بلکہ یہ روح کا ایک تجربہ ہے جس کی بنا پر استدلال کے ذریعہ عقاید کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے لیکن کلمتہ اللہ نے عقاید پر کبھی زور نہ دیا۔ برعکس اس کے آپ نے فرمایا کہ عقیدے کو ایمان کی جگہ غصب نہیں کرنی چاہیئے (متی ۷: ۲۱-۲۳)۔ آپ کی تعلیم کا سارا زور اس دلی جذبہ پر ہے جس کو آپ "ایمان" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اور جس کے سامنے تمام دیگر باتیں ہیچ اور کم مایہ ہیں اور جو ایمان ہی درحقیقت دنیا میں سب سے عظیم الشان طاقت ہے۔ آپ نے فرمایا "خدا پر ایمان رکھو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کوئی اس پہاڑ سے کہے تو اکھڑ جا اور سمندر میں جا پڑ۔ اور اپنے دل میں شک نہ کرے کہ جو کہتا ہے ہو جائیگا۔ تو اس کے لئے وہی ہوگا۔" (مرقس ۱۱: ۲۳-۲۴) حقیقی ایمان کی طاقت اس قدر زبردست ہے کہ آپ نے فرمایا "اگر تم میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو تو کوئی بات تمہارے لئے ناممکن نہیں ہوگی"۔ (متی ۱۷: ۲۰)

جہاں کہیں منجئ عالمین تشریف لے جاتے تھے آپ لوگوں میں ایمان کی تلاش کرتے تھے۔ (متی ۹: ۲۲ + ۱۵: ۲۸ + لوقا ۷: ۹ وغیرہ) آپ کیلئے دنیا

یہود اور غیر یہود پر منقسم نہ تھی۔ بلکہ ایمانداروں اور بے ایمانوں پر منقسم تھی۔ جہاں آپ نے غیر یہود میں ایمان دیکھا۔ آپ نے ان ایمانداروں کی نہ صرف تعریف کی بلکہ فرمایا کہ اُن کو آلِ ابراہیم پر ترجیح ہے۔ چنانچہ آپ نے رُومی صُوبہ دار کے ایمان کی نسبت فرمایا کہ "مَیں نے اسرائیل کے کسی شخص میں ایسا ایمان نہیں پایا۔ مَیں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ بہتیرے پُورب اور پچھم سے آ کر ابراہیم اور اضحاق اور یعقوب کے ساتھ آسمان کی بادشاہت کی ضیافت میں شریک ہونگے۔ مگر بادشاہت کے بیٹے باہر اندھیرے میں ڈالے جائیں گے"۔ (متی ۸: ۱۰-۱۲) +

(۲)

گناہوں کی مغفرت اور نجات:۔

جب ہم اناجیل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات منجی جہان جب کسی کو شفا بخشتے ہیں تو اپنی ذات اور شخصیت پر ایمان رکھنا اس اعجازی واقعہ کی شرط قرار دیتے ہیں۔ (مرقس ۲: ۵ + ۵: ۳۴ + ۱۰: ۵۲ + متی ۸: ۱۰ وغیرہ وغیرہ) اس ایمان کی بہترین صُورت یہ ہے کہ ہم خُدا کی مغفرت کے فضل پر کامل بھروسہ رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مُقدس پولوس کے نزدیک ایمان منجئ عالمین کی موت اور قیامت کے ساتھ وابستہ ہے (رومیوں ۳: ۲۵ + گلتیوں ۲: ۲۱) اور راستبازی ایمان کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ انسان کے ذاتی اعمال پر اس کا انحصار نہیں (گلتیوں ۲: ۱۶ + ۳: ۲-۱۴ + رومیوں ۳: ۲۷ الخ + ۴: ۱-۵ + ۹: ۳۲ + افسیوں ۲: ۸ + فلپیوں ۳: ۹ وغیرہ) تاکہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ اُس نے اپنے اعمال سے نجات کمائی ہے

بلکہ یہ محض خُدا کا فضل ہے (رومیوں ۳: ۲۴ + افسیوں ۲: ۸ وغیرہ)

بے منت و بے سوال و بے اِستحقاق
دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی تو ہے۔

کلمۃ اللہ نے اِس حقیقت کو ایک تمثیل کے ذریعہ واضح کیا۔ آپ نے فرمایا "آسمان کی بادشاہت اُس گھر کے مالک کی مانند ہے جو سویرے نکلا تاکہ اپنے انگوری باغ میں مزدور لگائے۔ اور اُس نے مزدوروں سے ایک دینار روز ٹھہرا کر اُنہیں اپنے باغ میں بھیج دیا پھر پہر دن چڑھے کے قریب نکلکر اُس نے اوروں کو بازار میں بیکار کھڑے دیکھا اور اُن سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ جو واجب ہے تم کو دونگا۔ پس وہ چلے گئے پھر اُس نے دوپہر اور تیسرے پہر کے قریب نکل کر دیسا ہی کیا اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکلکر اوروں کو کھڑے پایا اور اُن سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے اُنہوں نے اُس سے کہا اس لئے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا۔ اُس نے اُن سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ۔ جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بُلا اور پچھلوں سے لیکر پہلوں تک اُنکو مزدوری دیدے۔ جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے گئے تھے۔ تو اُنہیں ایک ایک دینار ملا جب پہلے مزدور آئے تو اُنہوں نے یہ سمجھا کہ ہمیں زیادہ ملیگا پر اُن کو بھی ایک ہی دینار ملا۔ جب ملا تو گھر کے مالک سے یہ شکایت کرنے لگے کہ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تُو نے اُنہیں ہمارے برابر کر دیا جنہوں نے دن بھر کا بوجھ اُٹھایا اور سخت دھوپ سہی اُس نے جواب دیکر ان میں سے ایک سے کہا میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا۔ کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا؟ جو تیرا ہے اُٹھا لے اور چلا جا۔ میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں اس پچھلے کو بھی

اُتنا ہی دُوں۔ کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں؟ یا تو اِس لئے کہ مَیں نیک ہُوں بُری نظر سے دیکھتا ہے"؟ (متی ۲۰: ۱-۱۶)

اِس تمثیل سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنے اعمال پہ نازاں ہو کر آسمان کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ آسمانی باپ کی ازلی محبّت کا نتیجہ ہے کہ وہ ازراہِ کرم و فضل گنہگار انسان کو اپنی بادشاہت میں جگہ دیتا ہے فقط اُس کی محبّت پر ہمارا ایمان چٹان کی طرح مضبوط اور محکم ہونا چاہیئے۔ خُدا کی محبّت اِس قدر زبردست اور غالب ہے کہ ہماری خطایئں اُس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتیں ؂

کہہ کے لبیک مغفرت دَوڑے
توبہ عاصی اگر کرے دِل سے

خُدا نیکوں اور بدکاروں دونوں کا باپ ہے اور دونوں سے یکساں محبّت رکھتا ہے۔ (متی ۵: ۴۵) ابوّت کا رشتہ گناہوں کی وجہ سے منقطع نہیں ہو جاتا۔ پس ابنیّت کا رشتہ توبہ کے ذریعہ ازسرِ نو قائم و مضبوط ہو جاتا ہے۔ نجات کی برکت حاصل کرنے کے لیئے توبہ پہلی اور لازمی شرط ہے۔ (مرقس ۱: ۱۵ + ۶: ۱۲ + متی ۱۱: ۲۱ - لوقا ۲۴: ۴۷ وغیرہ) توبہ سے مراد یہ ہے کہ ہماری طبیعت کا میلان کلیتہً بدل جائے۔ اور ہم گناہ آلودہ زندگی کو ترک کر کے خُدا کی طرف رجوع لائیں"۔ (متی ۱۳: ۱۵ + ۱۸: ۳)

کلمتہ اللہ نے ایک تمثیل کے ذریعہ اِس حقیقت کو لوگوں پر روشن کیا۔ اور فرمایا تم میں سے ایسا کون ہے جس کے پاس سو بھیڑیں ہوں اور اُن میں سے ایک کھوئی جائے تو ننانوے کو بیابان میں چھوڑ کر اُس کھوئی ہوئی کو جب تک مِل نہ جائے ڈھونڈھتا نہ رہے؟ پھر جب مِل جاتی ہے تو وہ خوش

ہو کر اُس کو کندھے پر اُٹھا لیتا ہے اور گھر میں پہنچ کر دوستوں اور پڑوسیوں کو بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے ساتھ خوشی کرو کیونکہ میری کھوئی ہوئی بھیڑ مل گئی۔ مَیں تم سے کہتا ہوں کہ اِسی طرح ننانوے راستبازوں کی نسبت جو توبہ کی حاجت نہیں رکھتے ایک توبہ کرنے والے گنہگار کی بابت آسمان پر زیادہ خوشی ہوگی"۔ (لوقا ۱۵: ۳-۷)۔

پھر ایک اور تمثیل کے ذریعہ کلمتہ اللہ نے یہی حقیقت لوگوں پر روشن کی کہ آسمانی باپ کی خوشی دوبالا ہو جاتی ہے جب کوئی گنہگار توبہ کر کے اُس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا "کون ایسی عورت ہے جس کے پاس دس درم ہوں اور ایک کھو جائے تو چراغ جلا کر گھر میں جھاڑو نہ دے اور جب تک مل نہ جائے کوشش سے ڈھونڈتی نہ رہے؟ پھر جب مل جاتا ہے تو سہیلیوں اور پڑوسنوں کو بلا کر نہ کہے کہ میرے ساتھ خوشی کرو۔ کیونکہ میرا کھویا ہُوا درم مل گیا۔ مَیں تم سے کہتا ہوں کہ اِسی طرح ایک توبہ کرنے والے گنہگار کی بابت خُدا کے فرشتوں کے سامنے خوشی ہوتی ہے۔ (لوقا ۱۵: ۸-۱۰)۔

اِسی حقیقت کو ایک اور تمثیل سے خُداوند نے واضح کیا اور فرمایا "کسی شخص کے دو بیٹے تھے۔ اُن میں سے چھوٹے نے باپ سے کہا کہ اے باپ مال کا جو حصّہ مجھ کو پہنچتا ہے مجھے دے۔ اُس نے اپنا مال متاع اُنہیں بانٹ دیا۔ بہت دن نہ گزرے کہ چھوٹا بیٹا اپنا سب کچھ جمع کر کے دُور دراز ملک کو روانہ ہُوا اور وہاں اپنا مال بدچلنی میں اُڑا دیا اور جب سب کچھ خرچ کر چکا تو اُس ملک میں سخت کال پڑا اور وہ محتاج ہونے لگا۔ پھر اُس ملک کے ایک باشندے کے ہاں جا پڑا۔ اُس نے اُس کو اپنے کھیتوں میں سؤور چرانے بھیجا اور اُسے آرزو تھی کہ جو پھلیاں سؤور کھاتے تھے اُنہیں سے اپنا پیٹ بھرے مگر کوئی اُسے نہ دیتا تھا۔ پھر اُس نے ہوش میں آ کر کہا کہ میرے باپ کے

کتنے ہی مزدوروں کو روٹی افراط سے ملتی ہے۔ اور میں یہاں بھوکا مر رہا ہوں! میں اُٹھ کر اپنے باپ کے پاس جاؤنگا اور اُس سے کہونگا کہ اَے باپ مَیں آسمان کا اور تیری نظر میں گنہگار ہُوا۔ اب اِس لائق نہیں رہا کہ پھر تیرا بیٹا کہلاؤں۔ مجھے اپنے مزدوروں جیسا کر لے۔ پس وہ اُٹھ کر اپنے باپ کے پاس چلا۔ وہ ابھی دُور ہی تھا کہ اُسے دیکھ کر اُس کے باپ کو ترس آیا اور دوڑ کر اُس کو گلے لگا لیا اور بوسے لئے۔ بیٹے نے اُس سے کہا کہ اَے باپ میں آسمان کا اور تیری نظر میں گنہگار ہُوا اب اس لائق نہیں رہا کہ پھر تیرا بیٹا کہلاؤں۔ باپ نے اپنے نوکروں سے کہا کہ اچھے سے اچھا جامہ جلد نکال کر اسے پہناؤ اور اُس کے ہاتھ میں انگوٹھی اور پاؤں میں جوتی پہناؤ۔ اور پلے ہوئے بچھڑے کو لا کر ذبح کرو تا کہ ہم کھا کر خوشی منائیں۔ کیونکہ میرا یہ بیٹا مُردہ تھا۔ اب زندہ ہُوا۔ کھویا ہُوا تھا۔ اب ملا ہے۔ پس وہ خوشی منانے لگے۔ (لوقا ۱۵: ۱۱-۲۴)

میری بندگی سے میرے جُرم افزوں

تیرے قہر سے تیری رحمت زیادہ

جب کوئی گنہگار تائب ہو کر خُدا کی طرف رجُوع کرتا ہے تو وہ معلوم کرتا ہے کہ اُس کا آسمانی باپ از راہِ محبّت مُدّت سے اُس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جو پہلے اپنے گناہوں کی وجہ سے خُدا سے دُور تھا اب خُدا کے خاندان میں نوکر کی طرح نہیں بلکہ بیٹے کی طرح رہتا ہے۔ (یُوحنّا ۱۵: ۱۵)

؎ تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ

کہا جو سر کو جھکا کر کہ گنہگار ہُوں مَیں (اقبال)

توبہ کے بعد خُدا اور اُس کے تائب بیٹے میں محبّت کی وجہ سے رفاقت کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہو جاتا ہے جو تا ابد قائم رہتا ہے۔ (یُوحنّا

(۵: ۱) آسمانی باپ کی نظر میں گناہ ایک ایسی شے نہیں جو ابد تک خدا اور انسان میں ایک وسیع خلیج حائل کر دے اور انسانی فطرت کو ایسا بگاڑ دے کہ وہ خدا کے ساتھ آئندہ کبھی رفاقت ہی نہ رکھ سکے۔ اناجیل کے مطابق گناہ ایک غلامی ہے جس سے کلمۃ اللہ ہمیں رہائی دیتا ہے۔ وہ ایک بیماری ہے جس سے ابن اللہ شفا بخشتا ہے۔ گناہ ایک قرض ہے جو خدا معاف کرتا ہے وہ ایک ناپاکی ہے جس سے ہم پاک صاف کئے جاتے ہیں کلمۃ اللہ یہودی ربیوں کی مانند گناہ کی ابتدا کا کوئی خاص نظریہ قائم نہیں کرتے آپ کی نظر میں گناہ ایک حقیقت ہے اور بس۔ آپ گناہ کی نسبت تعلیم دینے کے لئے اس دنیا میں نہیں آئے تھے۔ بلکہ گناہ سے نجات دینے کے لئے آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گناہ کا لفظ صرف سات مرتبہ اناجیل میں وارد ہوا ہے۔ اور منجی عالمین صرف تین موقعوں پر گناہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور وہ بھی گناہوں کی مغفرت کے سلسلہ میں۔ آپ کے نزدیک گناہ اس فعل یا جذبہ کا نام ہے۔ جو خدا اور انسان کے رشتہ میں خلل ڈالتا ہے۔ اس کے نتیجہ سے خدا کے نافرمان فرزند منجی عالمین کے ذریعہ رہائی حاصل کر کے از سر نو خدا کے خاندان میں شامل ہو جاتے ہیں۔

ایسے غفار اور پر محبت خدا پر راسخ ایمان رکھنے کا قدرتی اثر ہمارے اعمال و افعال پر پڑتا ہے۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا "چاہیئے کہ تم کامل ہو۔ جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے"۔ (متی ۵: ۴۸) یہ بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ہمارا ایمان آسمانی باپ پر ہے جس کی محبت تمام رکاوٹوں پر غالب ہے۔ تو اس پر ایمان رکھنے سے سب ناممکن باتیں ممکن ہو جاتی ہیں۔ زکی محصول لینے والا ابراہام کا بیٹا ہو جاتا ہے مریم مگدلینی مقدسہ بن جاتی ہے (متی

محصول لینے والا انجیل نویس ہو جاتا ہے۔ کمزور اور بزدل پطرس چٹان کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے۔ گنہگار قدسی ہو جاتے ہیں۔ ڈاکو فردوس میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ ضروری امر ہے کہ ہمارا ایمان ہمارے جذبات اور افعال کو متاثر کریگا۔ ہر قسم کے زندہ ایمان کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہمارے باطن صاف اور ہمارے اعمال نیک ہونگے۔ کیونکہ ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت بُرا پھل نہیں لا سکتا نہ بُرا درخت اچھا پھل لا سکتا ہے"۔ (متی ۷: ۱۷-۱۸) اسی حقیقت کو خداوند نے ایک فریسی عالم نکودیمس پر ان معنی خیز الفاظ میں ظاہر کیا۔ کہ "جب تک کوئی شخص از سرِ نو پیدا نہ ہو وہ خدا کی بادشاہت کو دیکھ نہیں سکتا"۔ (یوحنا ۳:۳) یہی وجہ ہے کہ منجیِ عالمین نے فرمایا کہ جن کا ایمان محض زبانی جمع خرچ کا ہے "جو مجھ سے اے خداوند اے خداوند کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگا۔ مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے"۔ (متی ۷: ۲۱) وہ لوگ جن کا ایمان اُن کے اعمال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا درحقیقت بدکار ہیں۔ خواہ وہ مسیح کے نام سے نبوّت کریں۔ بدروحیں نکالیں یا معجزے بھی دکھائیں (متی ۷: ۲۲-۲۳۔ لوقا ۱۳: ۲۷-۲۸) حقیقی ایماندار مقدسہ مریم صدیقہ سے بھی زیادہ مبارک حال ہیں۔ کیونکہ وہ "خدا کا کلام سنتے اور اُس پر عمل کرتے ہیں"۔ (لوقا ۱۱: ۲۷-۲۸) صرف ایسے لوگ کلمۃ اللہ کے حقیقی رشتہ دار ہیں آپ نے خود فرمایا ہے۔ "جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے۔ وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے"۔ (مرقس ۳: ۳۵)۔

لیکن جو شخص ایماندار ہو کر بھی اپنی زندگی کو "تاریک کاموں" میں

صرف کرتا ہے اور "دنیا کے نور" کی پیروی نہیں کرتا۔ خدا کی لامحدود محبت اُس شخص کی منتظر رہتی ہے کہ وہ کب توبہ کر کے رجوع لائے اور اپنی زندگی کو سدھارے۔ چنانچہ اس امر کو خداوند نے ایک تمثیل کے ذریعہ واضح کیا اور فرمایا "کسی کے انگوری باغ میں ایک انجیر کا درخت لگا ہوا تھا۔ وہ اُس میں پھل ڈھونڈھنے آیا اور نہ پایا۔ اِس پر اُس نے باغبان سے کہا کہ دیکھ تین برس سے مَیں اس انجیر کے درخت میں پھل ڈھونڈھنے آتا ہوں اور نہیں پاتا اسے کاٹ ڈال۔ وہ زمین کو بھی کیوں روکے؟ اُس نے جواب میں اُس سے کہا اے خداوند اس سال تو اور بھی اسے رہنے دے تاکہ مَیں اُس کے گرد تھالا کھودوں اور کھاد ڈالوں۔ اگر آگے کو پھلا تو خیر نہیں تو بعد اس کے کاٹ ڈالنا (لوقا ۱۳: ۶-۹) پس خدا کی محبت ہر گنہگار کی منتظر رہتی ہے لیکن اگر پھر بھی کوئی شخص اپنی مرضی کو خدا کی لازوال محبت کے تابع نہیں کرتا اور اس کو ٹھکراتا رہتا ہے۔ تو وہ فاعل خود مختار ہونے کی وجہ سے توبہ کا ہر موقعہ کھو کر اپنے آپ کو نجات کے امکان سے خود باہر کر دیتا ہے اور ایسے گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے جو معاف نہیں ہو سکتا۔ (متی ۱۲: ۳۲) کیونکہ وہ خود معافی سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ وہ اپنے فعل خود مختاری کی وجہ سے اُس درخت کی طرح ہو جاتا ہے جو اچھا پھل نہیں لاتا۔ وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے" (متی ۷: ۱۹) ایسا شخص اُس بے وقوف آدمی کی مانند ٹھہریگا جس نے اپنا گھر ریت پر بنایا اور مینہ برسا اور پانی چڑھا اور آندھیاں چلیں اور اُس گھر کو صدمہ پہنچا اور وہ گر گیا اور بالکل برباد ہو گیا۔" (متی ۷: ۲۶-۲۷)+

(۳)

دُعا۔

تائب گنہگار اور آسمانی باپ میں توبہ کے وسیلے رفاقت کا سلسلہ ازسرنو شروع ہو جاتا ہے۔ رفاقت کا رشتہ دُعا کے وسیلے قائم اور مضبوط رہتا ہے۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہُوا کہ خُدا اور انسان کے درمیان کسی تیسرے شخص کی ضرورت ہی باقی نہ رہی بلکہ انسان کا تعلق سیدھا خدا باپ سے پیدا ہو گیا ہے۔ یُوں کلمۃ اللہ نے کاہنوں اور ربیوں، فقیہوں اور شرع کے عالموں کے مختلف گروہوں کو جو خُدا اور انسان کے بیچ درمیانی ہونے کے دعویدار تھے کلیتہً موقوف کر دیا۔ اب ہمارا آسمانی باپ اپنے کلام کے ذریعہ اپنے بیٹوں کے ساتھ رفاقت رکھتا ہے اور بیٹے دُعا کے وسیلے اپنے آسمانی باپ کے ساتھ رفاقت رکھتے ہیں۔ اگر یہ رفاقت قائم رہتی ہے۔ تو جو بیٹا مانگیگا وہ اُس کے لئے ہو جائیگا۔ (یُوحنّا ۱۵: ۷) کلمۃ اللہ نے فرمایا "مانگو تو تمہیں دیا جائیگا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائیگا کیونکہ جو کوئی مانگتا ہے اُسے مِلتا ہے۔ اور جو ڈھونڈھتا ہے وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے۔ اُس کے واسطے کھولا جائے گا۔ (متی ۷: ۷-۸) پس جو کچھ دُعا میں ایمان کے ساتھ مانگو گے وہ سب تمہیں ملیگا۔" (متّی ۲۱: ۲۲)۔

لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری ~~تمام~~ درخواستیں خُدا باپ کی مرضی کے مطابق ہونی چاہئیں۔ کلمۃ اللہ نے ہم کو تعلیم دی ہے کہ ہماری دُعاؤں اور مناجاتوں کا اصُول یہ ہونا چاہیئے کہ خُدا کی مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی

ہے زمین پر بھی ہو۔" (متی ۶: ۱۰) پس ہماری تمام مناجاتیں اسی ایک اصول کے ماتحت ہونی چاہئیں۔ خود ابن اللہ نے جب باغ گتسمنی میں زور زور سے پکار کر اور آنسو بہا بہا کر" (عبرانیوں ۵: ۷) خدا سے درخواست کی تو ساتھ ہی بارگاہ ایزدی میں عرض کی کہ "اے باپ! جیسا میں چاہتا ہوں۔ ویسا نہیں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی ہو۔ اے میرے باپ اگر یہ پیالہ میرے پئے بغیر نہیں ٹل نہیں سکتا۔ تو تیری مرضی پوری ہو۔" (متی ۲۶: ۳۹ و ۴۲) جب ہمارے کامل نمونہ نے اپنی مرضی کو رضائے الہٰی کے تابع کیا۔ تو "اس کی سنی گئی" (عبرانیوں ۵: ۷۔ یوحنا ۱۱: ۴۲) اسی طرح ہم کو بھی لازم ہے کہ ہم بھی اپنے خیالات اور جذبات کو رضائے الہٰی کے تابع کریں۔ تاکہ ہماری دعائیں اور التجائیں بھی مقبول ہوں۔

دعا کا واحد مقصد یہ ہے۔ کہ ہم مشیت الہٰی کو معلوم کر کے اس پر عمل کرنے کی توفیق خدا سے حاصل کریں۔ ایک ابتدائی مسیحی مصنف کہتا ہے کہ "تم مانگتے ہو اور پاتے نہیں اس لئے کہ بری نیت سے مانگتے ہو تاکہ اپنی عیش وعشرت میں خرچ کرو۔" (یعقوب ۴: ۳) ہماری درخواستیں خود غرضی اور دنیاوی خیالات پر مبنی نہیں ہونی چاہئیں۔ بلکہ رضائے الہٰی اور اس کی قدوس مرضی کے تابع ہونی چاہئیں۔ تب وعدہ خداوندی پورا ہوگا۔ کہ "جو کچھ تم دعا میں مانگتے ہو یقین کرو کہ تم کو مل گیا۔ اور تمہارے لئے ہو جائیگا۔" (مرقس ۱۱: ۲۴)۔

بعض لوگ جب دعا کرتے ہیں۔ اور ان کی دعاؤں کا جواب ملتا نظر نہیں آتا تو وہ خدا کی شفقت و رحمت اور اس کی محبت اور پروردگاری پر شک کر کے اس کو "بے رحم" "بے انصاف" اور "لاپرواہ" خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ کلمتہ اللہ ایسے اشخاص کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں "تم میں ایسا کونسا آدمی ہے

کہ اگر اُس بیٹا اُس سے روٹی مانگے تو وہ اُسے پتھر دے؟ یا اگر مچھلی مانگے تو اُسے سانپ دے؟ پس جب کہ تم بُرے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینی جانتے ہو تو تمہارا باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دیگا"؟ (متی ۷: ۹-۱۱) آپ کا مطلب یہ ہے کہ فرض کرو کہ تمہارا خیال درست ہے اور بفرض محال خُدا "بے رحم" ہے۔ تو بھی وہ ہمارا باپ ہے۔ بے رحم سے بے رحم باپ بھی "اپنے بچوں کو اچھی چیزیں" دیتا ہے۔ تو (نعوذ باللہ) "بے رحم" آسمانی باپ اپنے بچوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دیگا؟

آپ نے ایسے اشخاص کو "بے انصاف" قاضی کی تمثیل سنائی۔ اور فرمایا "کسی شہر میں ایک قاضی تھا۔ نہ وہ خُدا سے ڈرتا نہ آدمی کی کچھ پرواہ کرتا تھا۔ اور اُسی شہر میں ایک بیوہ تھی۔ جو اُس کے پاس آ کر یہ کہا کرتی تھی کہ میرا انصاف کر کے مجھے مدعی سے بچا۔ اُس نے کچھ عرصہ تک تو نہ چاہا لیکن بعد اُس کے اپنے جی میں کہا کہ گو مَیں نہ خُدا سے ڈرتا ہوں اور نہ آدمیوں کی کچھ پرواہ کرتا ہوں تو بھی اس لئے کہ یہ بیوہ مجھے ستاتی ہے مَیں اس کا انصاف کرونگا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بار بار آ کر میرا ناک میں دم کر دے"۔ (لوقا ۱۸: ۱-۵) کلمتہ اللہ کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک "بے انصاف" قاضی نے بیوہ کی فریاد رسی کی تو بفرض محال خُدا "بے انصاف" ہی سہی کیا وہ انصاف نہ کریگا صرف ہم کو "ہر وقت دُعا مانگتے رہنا چاہیئے"۔ (لوقا ۱۸: ۱)۔

کلمتہ اللہ نے ایک اور تمثیل کے ذریعے ایسے اشخاص پر اُنکے خیالات کی بطالت ظاہر فرمائی۔ آپ نے فرمایا "تم میں سے کون ہے جس کا ایک دوست ہو اور وہ آدھی رات کو اُس کے پاس جا کر اُس سے کہے کہ اے دوست مجھے تین روٹیاں دے۔ کیونکہ میرا ایک دوست سفر کر کے میرے پاس آیا ہے

اور میرے پاس کچھ نہیں کہ اُس کے آگے رکھوں اور وہ اندر سے جواب میں کہے مجھے تکلیف نہ دے۔ اب دروازہ بند ہے اور میرے لڑکے میرے پاس بچھونے پر ہیں میں اُٹھ کر تجھے دے نہیں سکتا۔ مَیں تم سے کہتا ہوں اگرچہ وہ اِس سبب سے کہ اُس کا دوست ہے اُٹھ کر اُسے نہ دے۔ تاہم اُس کی بے حیائی کے سبب اُٹھ کر جتنی درکار ہیں اُسے دیگا۔" (لوقا ۱۱: ۵-۸)

آپ کا مطلب یہ تھا کہ جب ہمارے دُنیاوی دوست جو ہماری ضروریات کی طرف سے لاپروا ہوتے ہیں اور ہماری حاجت روائی کرنا نہیں چاہتے ہماری ضرورت دیکھ کر وقت بے وقت تکلیف اُٹھا کر بھی ہم پر چاروناچار مہربانی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں تو بفرض محال اگر ہمارا آسمانی باپ "لاپروا" ہے تو کیا وہ ہماری ضرورت دیکھ کر ہماری حاجت روائی نہ کریگا؟ لیکن ہمارا خُدا نہ تو بیرحم دُنیاوی باپ کی طرح "بے رحم" ہے۔ نہ بے انصاف قاضی کی طرح "بے انصاف" ہے اور نہ وہ لاپروا دوست کی طرح "لاپروا" ہے۔ وہ ہمارا آسمانی باپ ہے جو ہم کو ابدی محبت سے پیار کرتا ہے"۔ (یرمیاہ ۳۱: ۳) اور ہمارے مانگنے سے پہلے ہماری ضرورت سے واقف ہے (متی ۶: ۸) وہ ضرور ہماری دعاؤں کو سنیگا اور ہماری حاجت روائی کریگا۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم مستعدی اور دلسوزی سے" (لوقا ۲۲: ۴۴) اپنی درخواستیں کرتے جائیں" ہم چپکے نہ رہیں اور خُدا کو چین نہ لینے دیں"۔ (یسعیاہ ۶۲: ۶) جب تک ہماری دُعائیں بارگاہِ ایزدی میں شرفِ اجابت وقبولیت حاصل نہ کرلیں۔ ممکن ہے کہ ظاہرا طور پر ہم کو ہماری دُعاؤں اور التجاؤں کا جواب ملتا نظر نہ آتا ہو۔ لیکن اس سے ہم کو دِل برداشتہ نہیں ہو جانا چاہیئے کیونکہ لاپروا دوست اور بے انصاف قاضی سے بھی جواب ملتا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن پھر بھی اُنہوں نے سائلوں کی مشکلات کو حل کر دیا

خواہ کسی وجہ سے بھی بارگاہِ الٰہی سے جواب ملتا نظر نہ آئے ہم کو "ہمت نہ ہارنی چاہیئے"۔ بلکہ "ہر وقت دُعا مانگتے رہنا چاہیئے"۔ (لوقا ۱۸:۱)

منجیٔ کونین کا طرزِ عمل ہمارے لئے ایک کامل نمونہ ہے آپ کے لئے دُعا کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو صرف خاص اوقات میں کی جائے۔ جو یہودی ربیوں نے مقرر کر رکھے تھے نہ وہ کوئی ایسی بات تھی جو صرف دُکھ مصیبت تنگی یا ضرورت کے وقت ہی مانگی جائے۔ آپ کے خیال میں کسی دُعا کے خاص الفاظ میں اعجازی اثر موجود نہ تھا اور نہ دُنیاوی ضروریات کے ماتحت آپ دُعا کیا کرتے تھے۔ زبور نویس کی دُعاؤں میں ہم کو دُنیاوی عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ اپنی دُعاؤں میں خدا سے حجت و تکرار کرتا ہے لیکن کلمۃ اللہ کی دُعائیہ زندگی سے یہ تمام باتیں خارج ہیں۔

اناجیل میں مرقوم ہے کہ آپ کی عادت تھی کہ "صبح سویرے دن نکلنے سے بہت پہلے" آپ اُٹھ کر ویران جگہ میں جاتے اور دُعا مانگا کرتے تھے۔ (مرقس ۱: ۳۵+ لوقا ۱۱:۱+ متی ۱۴: ۲۳) آپ شب بیدار تھے اور "دُعا مانگنے میں ساری رات" گذار دیا کرتے تھے (لوقا ۶: ۱۲) تمام ضروری امور کو سرانجام دینے سے پہلے آپ اپنے باپ سے دُعا کرتے (لوقا ۹: ۱۸ + ۱۶: ۱۳+ مرقس ۹: ۲۶) دُکھ تکلیف کے وقت آپ تسلّی کے لئے آسمانی باپ کی طرف رجوع کرتے۔ (مرقس ۱۴: ۳۲ - ۳۴) باپ کی حمد و ستائش ہمیشہ آپ کی وردِ زبان رہتی (متی ۱۱: ۲۵ - ۲۷ + لوقا ۱۰: ۲۱ - ۲۲ + یوحنا ۱۱: ۴۱ وغیرہ)

شاگردوں نے جو شب و روز خلوت اور جلوت میں آپ کے ساتھ رہتے تھے دیکھا کہ آپ مردِ دُعا ہیں اور مستجاب الدعوات ہیں۔ تو آپ سے درخواست کی کہ اے ربّی ہم کو بھی دُعا مانگنی سکھا۔ (لوقا ۱۱: ۱) اُستادِ ازل نے اپنی

زبانِ مبارک سے فرمایا کہ جب تم دعا مانگو تو کہو" اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے تیری بادشاہت آئے تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے۔ اور جس طرح ہم نے اپنے قصورواروں کو معاف کیا ہے تو بھی ہمارے گناہ ہمیں معاف کر۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ لا۔ بلکہ برائی سے بچا"۔ اس مختصر سی دعا میں سالکینِ راہِ خدا کے اعلیٰ ترین جذبات اور انتہائی آرزوئیں موجود ہیں۔ یہ چھ فقرے نہایت ہی مانع اور جامع حق اللہ اور حق العباد پر محیط اور اُن پر شامل ہیں۔ پہلے تین فقروں میں خدا کی بادشاہت کی آمد۔ خدا کے نام کی تقدیس اور رضائے الٰہی کے پورا ہونے کے لیے دعا ہے اور باقی تین میں خدا کی پروردگاری الٰہی مغفرت اور شیطان سے پناہ اور نیکی کرنے کی توفیق کے لئے دعا کی گئی ہے۔

اس دعا کا معلّم ہم کو فرماتا ہے۔ کہ "دعا مانگتے وقت دیگر اقوام کے لوگوں کی مانند بک بک نہ کرو کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے بہت بولنے کے سبب ہماری سنی جائیگی"۔ (متی ۶ : ۷) دعا میں ہم طوطے کی طرح رٹے ہوئے الفاظ نہ پڑھ کر سنائیں۔ اور نہ ہماری زبانیں مشین کی طرح چلیں ہم اہلِ ہنود کی طرح رام رام نہ کریں۔ اور نہ اہلِ اسلام کی طرح تسبیح پر اللہ اللہ جپتے رہیں ان مذاہب کے لوگوں کا خیال ہے کہ صرف خدا کا نام لینے میں کوئی اعجازی اثر یا جادو موجود ہے۔ لہٰذا ان کے "بہت بولنے کے سبب اُن کی سنی جائیگی۔ دعا کرتے وقت یہ نہ ہو کہ ہم زبان سے الفاظ نکالتے جائیں اور توجہ خدا باپ کی طرف نہ ہو اور نہ ہم مسلمان کی طرح غیر زبان میں دعا کریں اس قسم کی دعا سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ انسانی کلام اندرونی مدعا مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے

وضع کیا گیا ہے۔ پس جب تک ہمارے اندر کوئی خواہش یا خیال ظاہر ہونے کے لئے جوش زن نہ ہو ہم کو خواہ مخواہ دعا میں بک بک نہیں کرنا چاہیئے لیکن اگر دل میں خواہش ہو تو خواہ ہم کہیں ہوں، کسی حالت میں ہوں کسی طرح کے کپڑوں میں ملبوس ہوں۔ ہمارا رُخ دنیا کے کسی کونہ کی طرف ہو ہم اپنے آسمانی باپ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم ہمیں دیگر ادیانِ عالم میں نہیں ملتی مثلاً قرآن بڑی تفصیل سے آدابِ عبادت ہم کو بتاتا ہے۔ (نساء آیت ۴۶۔ مائدہ آیت ۸) اوقاتِ عبادت پر قید لگاتا ہے۔ (ہود آیت ۱۱۶۔ بنی اسرائیل آیت ۸۰) جائے عبادت کا بھی ذکر کرتا ہے۔ (البقر آیت ۱۸۳۔ ۱۹۲۔ ۱۹۴) نمازی کے قبلہ رُخ ہونے پر مصّر ہے۔ (بقر آیت ۱۲۹) حکم دیتا ہے کہ خاص ایام میں اور خاص اوقات میں اور خاص حالات میں دعا بالکل نہ کی جائے (نسا آیت ۴۶) لیکن کلمۃ اللہ کے روحانی اصول نے دعا اور نماز کو زمان و مکان کی قیود سے اور تمام رسوم و رواج سے آزاد کر دیا ہے۔ عیسائی ہر وقت دعا کر سکتا ہے۔ وہ ہر سمت کو اپنا قبلہ بنا سکتا ہے۔ اس کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی وہ سجدہ کرتا ہے مگر رکوع و سجود کے شمار میں سرگردان نہیں رہتا ؎

بخدا خبر ندارم چو نماز می گذارم
کہ تمام شد رکوعِ کہ امام شد فلانے

(مولانا روم)

یہودیوں کی روزمرہ زندگی میں تین باتیں تھیں جس پر ہر راستباز شخص عمل کرتا تھا۔ یہ تین باتیں دعا۔ خیرات اور روزہ تھیں توبیت کی کتاب میں لکھا ہے "دعا روزہ کے ساتھ اور خیرات راستبازی کے ساتھ اچھی

ہے"۔ (۸:۱۲) دُعا روزانہ تین دفعہ مقرری اوقات پر کی جاتی تھی اور یہودی یہ بھی کہتے تھے کہ ہر شخص دُعا کے مقررہ وقت پر دُعا کرے خواہ وہ کہیں ہی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ "لوگ" بازاروں کے موڑوں پر کھڑے ہو کر دُعا مانگا کرتے تھے۔ (متی ۶: ۵) اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا تھا۔ کہ بہت سے لوگ محض دکھلاوے کی خاطر دُعا مانگا کرتے تھے۔ اس کے خلاف منجئی عالمین ہم کو خبردار کرتے ہیں آپ نے یہ تعلیم دی کہ دُعا میں ریاکاری کی قطعی کوئی آمیزش نہ ہو۔ آپ نے فرمایا "جب تم دُعا مانگو تو ریاکاروں کی مانند نہ ہو۔ کیونکہ وہ عبادتخانوں اور بازاروں کے موڑوں پر کھڑے ہو کر دُعا مانگنی پسند کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ اُنہیں دیکھیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ وہ اپنا اجر پاچکے۔ بلکہ جب تُو دُعا مانگے تو اپنی کوٹھڑی میں جا اور دروازہ بند کرکے اپنے باپ سے جو پوشیدگی میں ہے دُعا مانگ۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دیگا"۔ (متی ۶: ۵-۶) دُعا کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے آسمانی باپ کے ساتھ رفاقت رکھیں نہ کہ دکھلاوے کی خاطر اللہ کا نام رٹا کریں۔ کوئی بیٹا صرف دُوسروں کو دکھلانے کیخاطر اپنے باپ سے باتیں نہیں کرتا۔ تو پھر ہم کیوں خُدا باپ کے ساتھ خلوص نیت سے رفاقت نہ رکھیں؟ ریاکاری کی دُعا درحقیقت ایک دام تزویر ہے جس میں آدمی پھانسے جاتے ہیں۔ ریاکار خُدا کی آڑ میں آدمیوں کا شکار کرتے ہیں۔ وہ اُن کے پاس "بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں لیکن باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیے ہیں"۔ (متی ۷: ۱۵) ریاکار درحقیقت نقال (ایکٹر) ہیں جو دُنیا کی نمائش گاہ پر راستبازوں کا سوانگ بھر کے اپنے سامعین سے واہ واہ کے نعرے سُن کر خوش ہوتے ہیں۔ اور خراجِ تحسین وصول کرتے

ہیں۔ یہ لوگ "اپنا اجر حاصل کر چکے"۔ اُن کا طلسم نظر فریب ہے۔ وہ خوش عقیدہ لوگوں کو اُلّو بناتے ہیں لیکن حقیقی راستباز اِس طرح خُدا کا مضحکہ نہیں اُڑاتا۔ وہ محض دکھلاوے اور عبادت نمائی کی خاطر خُدا سے دُعا نہیں مانگتا بلکہ "اپنی کوٹھڑی میں" "جا کر" "دروازہ بند کرکے" دل سوزی مستعدی اور خلوصِ نیّت سے خُدا کے ساتھ رفاقت رکھتا ہے۔

کلمۃ اللہ کی تعلیم سے نماز کی ظاہری رسُوم کی ادائیگی کا عنصر کلیتہً غائب ہے۔ آپ کی تعلیم صرف اعلیٰ ترین روحانی اصُول پر ہی مشتمل ہے یہودیت میں اسلام اور ہندو مذہب کی طرح ظاہری رسُوم کی بھرمار تھی۔ اِس مذہب کے مطابق خُدا ایک سلطان تھا۔ اور جس طرح سلطانی دربار میں آداب و مراسم ملحوظ رکھنے پڑتے ہیں۔ اِسی طرح ظاہری رسُوم کی ادائیگی یہودیت کا جزو لاینفک تھی۔ لیکن جب خُدا کی کلمۃ اللہ نے تعلیم دی اُس کا تعلق ظاہری رسُوم سے رتی بھر نہ تھا۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا "سچے پرستار باپ کی پرستش رُوح اور سچائی سے کرینگے۔ کیونکہ باپ اپنے لئے ایسے ہی پرستار ڈھونڈھتا ہے خُدا رُوح ہے۔ اور ضرور ہے کہ اُس کے پرستار رُوح اور راستی سے پرستش کریں"۔ (یوحنّا ۴: ۲۳-۲۴)

(۴)

روزہ :-

سطورِ بالا میں ذکر ہو چکا ہے کہ روزہ ہر یہودی راستباز کی زندگی کا حصّہ تھا۔ اہلِ یہود کو موسوی شریعت میں صرف ایک روزہ کا حکم تھا

یعنی کفارہ کا روزہ" (احبار ۱۶: ۲۹ + ۲۳: ۲۷) لیکن کلمۃ اللہ کے ایام میں پانچ یا چھ پبلک روزے تھے ان کے علاوہ راسخ الاعتقاد یہودی ہفتہ میں دو دن روزہ رکھتے تھے (لوقا ۱۸: ۱۲) یعنی جمعرات کے روز جب ربی کہتے تھے کہ حضرت موسیٰ کوہِ سینا پر گیا تھا۔ اور سوموار کے روز جب ان ربیوں کے مطابق وہ پہاڑ پر سے اُترا تھا یہ روزے فرض نہ تھے لیکن فریسی ان کو مزید ثواب حاصل کرنے کے لئے رکھتے تھے۔ اور اُن کو جو روزہ دار نہیں تھے وہ ملامت کا نشانہ بناتے تھے۔ (مرقس ۲: ۱۸) روزہ کے دن وہ اپنے سروں پر راکھ ڈالتے تھے۔ اور منہ نہیں دھوتے تھے۔ بلکہ اُن کو ڈھانپ لیتے تھے۔ تاکہ لوگ اُن کی طرف متوجہ ہوں۔ ربی یشوع بن حنانیاہ کی بابت لکھا ہے کہ اُس کا چہرہ روزہ داری کی وجہ سے تمام عمر کالا رہتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے منہ پر راکھ ڈالے رکھتا تھا۔

اسلام میں بھی روزہ فرض ہے۔ قرآن کے مطابق ماہ رمضان میں سحر سے لیکر غروب آفتاب تک کھانے پینے سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ (بقرع ۲۳) جس طرح اہلِ یہود روزہ کے دن ظاہری رسوم کو ادا کرتے تھے اسی طرح اہلِ اسلام کے لئے ماہ رمضان وبالِ جان ہو جاتا ہے۔

کلمۃ اللہ نے حکم دیا ہے کہ روزہ میں ریاکاری کی آمیزش بالکل نہ ہو۔ آپ نے فرمایا "جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں۔ تاکہ لوگ اُنہیں روزہ دار جانیں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ بلکہ جب تُو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو تاکہ آدمی نہیں۔ بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے

تجھے بدلہ دیگا۔" (متی ۶: ۱۶-۱۸) +

(۵)

خلوصِ نیّت:-

کلمتہ اللہ ہر طرح کی ظاہرداری، عبادت نمائی اور ریاکاری کے جانی دشمن تھے۔ آپ نے بار بار فریسیوں کو اُن کی ریاکاری کی وجہ سے ملامت کی اور اپنے شاگردوں کو خبردار کیا اور فرمایا کہ فریسیوں اور صدوقیوں کی ریاکاری کے خمیر سے ہوشیار رہنا۔ (متی ۱۶: ۶) آپ نے اُن دین فروش فریسیوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ "اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی۔ تو تم آسمان کی بادشاہت میں ہرگز داخل نہ ہوگے" (متی ۵: ۲۰) سامعین کی نظروں میں یہ حکم سب سے بھاری اور مشکل معلوم ہُوا ہوگا۔ کیونکہ یہودی ربیوں کے خیالات کے مطابق فقیہی اور فریسی مجسّم راستبازی تھے، اور عامتہ الناس کے لیئے اُن سے بڑھ کر ہونا تو درکنار۔ اُن کی طرح راستباز ہونا محال تصوّر کیا جاتا تھا۔ لیکن منجئی عالمین ہر اپرے غیرے نتھو خیرے کو فرماتے ہیں کہ وہ اُن سے بڑھ کر راستباز ہوں۔ کیونکہ ان کی راستبازی خُدا کی نظر میں ریاکاری کی وجہ سے وقعت نہیں رکھتی۔ کلمتہ اللہ نے دین فروش فریسیوں پر سے اُن کی مصنوعی تقدیس کا پردہ ہٹا دیا۔ اور اُن کو بے نقاب کرکے فرمایا کہ "اے فریسیو! تم پیالے اور رکابی کو اُوپر سے تو صاف کرتے ہو۔

لیکن تمہارے اندر لوٹ اور بدی بھری ہوئی ہے۔ پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کرو تاکہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں اُے ریاکار فقیہو اور فریسیو۔ تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتے ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو" (متی ۲۳: ۲۵-۲۸)

جس یونانی لفظ کا ترجمہ "ریاکار" کیا گیا ہے اُس کے معنی نقال یا ایکٹر کے تھے۔ پس خداوند کی نظر میں فریسی اور عالم شرع نقال اور ایکٹر تھے۔ اُن کے افعال، اُن کی باتیں، اُن کے کپڑے تک نقالوں کے سے تھے (متی ۲۳: ۵) اُن کی تمام زندگی ایک سوانگ تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کے لئے ٹھوکر کا باعث تھے۔ وہ آسمان کی بادشاہت کو لوگوں پر "بند" کر دیتے تھے اور نہ وہ آپ اُس میں داخل ہوتے تھے اور نہ کسی کو داخل ہونے دیتے تھے۔ (متی ۲۳: ۱۳) جس طرح ایکٹروں کے الفاظ کا تعلق اُن کے دلی جذبات سے نہیں ہوتا۔ ویسے ہی فریسیوں کی زبان سے جو تعلیم نکلتی تھی وہ لوگوں پر اثر نہیں کرتی تھی۔ (مرقس ۱: ۲۲) وہ فصیح اللسان خطیب اور طلیق اللسان واعظ تھے۔ مگر اُن کی قدر گراموفون کے ریکارڈوں سے زیادہ نہ تھی۔ ...... اُن کی وعظیں ان کے ذاتی تجربہ پر مبنی نہ تھیں۔ اُن کا جوش و خروش یکسر تصنع تھا اور یہ سوانگ اس واسطے رچایا جاتا تھا کہ لوگ اُن پر اعتماد کر کے اُن کے دام فریب میں مبتلا ہو جائیں۔ عامۃ الناس کہتے تھے ؎

جبہ و دستار و تسبیح اور واعظ واعظاں
ان دعا بازوں کی ہم نے پارسائی دیکھ لی

(۶)

شاگردی کی شرطیں:-

ریاکاری اور ظاہرداری کا قلع قمع کرنے کے لیے خداوند مسیح نے اپنے شاگردوں کے لیے سخت ترین معیار مقرر فرمائے۔ آپ نے علانیہ اقرار کو لازمی قرار دیا اور فرمایا کہ "جو کوئی اس زناکار اور خطاکار پشت میں مجھ سے اور میری باتوں سے شرمائے گا۔ ابن آدم بھی اس سے شرمائیگا۔ جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا انکار کرے گا میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اس کا انکار کروں گا" (لوقا ۹: ۲۶ + متی ۱۰: ۳۲-۳۳) کلمتہ اللہ نے اس پر ہی کفایت نہ کی بلکہ فرمایا کہ آپ کی خاطر آپ کے پیروؤں کو انتہا درجہ کی مصیبت اور ذلت سہنی پڑیگی۔ خلوص نیت کو معلوم کرنے کے لیے نہ صرف علانیہ اقرار کی ضرورت ہے بلکہ صبر اور استقلال سے جور و ظلم کی برداشت کرنا خلوص قلب کا بہترین ثبوت ہے۔ آپ کی ہدایت آپ کا وہ "چھاج" تھا جس سے آپ نے "کھلیان کو خوب صاف کیا" اور گیہوں کو بھوسی سے جدا کر دیا (متی ۳: ۱۲) دنیادار اور ریاکار انسان ایذا رسانی کی برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا علانیہ اقرار دلی جذبات کے مطابق نہیں ہوتا۔ لیکن جو شخص اپنے دلی جذبات کی خاطر ہر طرح کی قربانی مستقل مزاجی کے ساتھ برداشت کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ اس کے خلوص کی نسبت کوئی شخص شبہ نہیں کر سکتا۔ کلمتہ اللہ نے فرمایا کہ دنیا کے لوگ آپ کے شاگردوں سے عداوت رکھیں گے۔ (یوحنا ۱۵: ۱۹-۲۰) آپ نے حواریوں کو مخاطب کر کے فرمایا: "کیا تم گمان کرتے ہو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں

میں تم سے کہتا ہوں کہ نہیں. بلکہ جدائی کرانے . باپ بیٹے سے مخالفت رکھیگا اور بیٹا باپ سے، ماں بیٹی سے اور بیٹی ماں سے. ساس بہو سے اور بہو ساس سے مخالفت رکھے گی" (لوقا ۱۲: ۵۱-۵۳) پس" جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں. جو کوئی بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں" (متی ۱۰: ۳۷) آپ نے شاگردوں کو خبردار کیا اور فرمایا "خبردار ہو. لوگ تم کو عدالتوں کے حوالے کریں گے. تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے لیکن جب لوگ میرے سبب تمہیں لعن طعن کریں گے اور ستائیں گے اور ہر طرح کی بُری باتیں ناحق کہیں گے. تو تم مبارک ہو گے" (متی ۱۰: ۱۷-۱۸ + ۵: ۱۱) آپ نے علی الاعلان "سب سے کہا اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی سے انکار کرے اور ہر روز اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے. کیونکہ جو کوئی اپنی جان بچانی چاہے وہ اُسے کھوئے گا. اور جو کوئی میرے اور انجیل کے واسطے اپنی جان کھوئے وہی اُسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھے گا. آدمی اگر ساری دنیا کو حاصل کرے اور اپنی جان کھودے تو اُسے کیا فائدہ ہو گا؟" (لوقا ۹: ۲۳-۲۵ + مرقس ۸: ۳۳-۳۷ + یوحنا ۱۲: ۲۴-۲۶)

رسم عاشق نیست با یک دل دو دلبر داشتن
یا ز جاناں یا ز جاں بایست دل بر داشتن

ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حواریوں اور دیگر سننے والوں کے دلوں پر ان الفاظ کا کیا اثر ہوا ہو گا. وہ لوگ اس خیال میں تھے کہ مسیح موعود اقوام عالم پر فاتح ہو کر اُن کو اپنا باجگذار بنائے گا اور اپنے پیروؤں کی اپنی

بادشاہت میں عزت افزائی کرے گا (مرقس ۱۰: ۳۷) مسیح مصلوب کا تصور اُن کے لئے اجتماعِ نقیضین کی بہترین مثال تھا۔ لیکن کلمۃ اللہ نے اُنکے خیالات کو صحیح کیا اور خداوند مسیح نے اُن کے سامنے نہایت صاف الفاظ میں شاگردی کی وہ شرطیں پیش کیں جو اُن کے وہم وگمان میں بھی کبھی نہ آئی تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ انسانی زندگی کا بہترین اور انسب مقصد آپ کی پیروی ہے اور سب سے گراں مایہ متاعِ حیات آپ کی محبت ہے۔ جس شخص کا دامن اس متاع سے خالی ہے۔ اُس کا دعوئ نجات وایمان درا صل بے دلیل ہے آپکی پیروی میں دنیاوی عزت، حشمت، شان وشوکت اور جاہ وجلال نہیں ملے گا۔ بلکہ۔ دکھ۔ تکلیف، بے عزتی۔ بیجرمتی۔ ایثار نفسی۔ قربانی۔ اپنی جان سے دشمنی بلکہ صلیب آپ کے پیروؤں کا حصہ ہوگی (متی ۱۰: ۲۳) ان کو آپ کی محبت کی پاداش میں ہدف مطاعن بنایا جائے گا۔ آپ نے اس حقیقت کو واضح کرنے کی خاطر اپنے شاگردوں کے سامنے دو دنیاوی مثالیں بھی پیش کیں آپ نے فرمایا "تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک بُرج بنانا چاہے۔ تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرلے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر اس پر ہنسنا شروع کریں کہ اس شخص نے عمارت بنانی شروع کی مگر تیار نہ کر سکا۔ یا کون ایسا بادشاہ ہے جو دوسرے بادشاہ سے لڑنے جاتا ہو۔ اور پہلے بیٹھ کر مشورہ نہ کرے کہ آیا میں دس ہزار سے اس کا مقابلہ کر سکتا ہوں یا نہیں جو بیس ہزار لے کر مجھ پر چڑھا آتا ہے؟ نہیں تو جب وہ ہنوز دور ہی ہے۔ ایلچی بھیج کر صلح کی شرطوں کی درخواست کرے گا۔ پس اسی طرح تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کرے

وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا (لوقا ۱۴: ۲۸-۳۳) خداوند کا مطلب یہ ہے کہ دنیادار شخص کسی کام کو ہاتھ لگانے سے پہلے اپنے نفع نقصان کو دیکھ لیتا ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے ع

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

اسی طرح واجب ہے جو شخص منجئ عالمین کا شاگرد ہونا چاہے وہ یہ جان لے کہ بے عزتی اور تکلیف اس کا حصہ ہوں گی تاکہ بعد میں اس کو پشیمان نہ ہونا پڑے۔ کیونکہ "جو کوئی اپنا ہاتھ ہل پر رکھ کر پیچھے دیکھتا ہے وہ خدا کی بادشاہت کے لائق نہیں" (لوقا ۹: ۶۲) ع

دماغ عشق نداری بہائے زلف مپرس
کہ این معاملہ با خاطر پریشاں نیست

(۷)

بزرگوں کی روایات اور الٰہی احکام

سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے کہ فریسی، شریعت اور صحائف انبیاء کے علاوہ بزرگوں کی روایات پر عمل کرنا نجات کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ یہودی ربیوں کی تاویلیں اور تفسیریں فریسی مذہب کا جزو اعظم تھیں۔ طالمود اس بات کا شاہد ہے کہ یہود اپنے ربیوں کی کتب اور بزرگوں کی روایات کی رجوع اُن مبنی تھیں، اتنی قدر کرتے تھے کہ وہ پرستش سے کسی طرح کم نہ تھی۔ انہوں نے اس امر میں اس قدر مبالغہ سے کام لیا کہ انہوں نے مشناہ اور گمرا یعنی اپنی روایات کی کتب کو تورات مقدس سے بھی چار قدم آگے بڑھا دیا چنانچہ

وہ کہتے تھے کہ توراۃ نمک کی طرح ہے لیکن مشناہ مرچ کی مانند اور گمرا مصالحہ کی مانند ہے۔ توراۃ پانی کی طرح ہے لیکن مشناہ مے کی طرح اور گمرا خوشبودار اور مصالحہ دار شراب گاڑھا ہے۔ توراۃ بدن ہے لیکن مشناہ نفس اور گمرا زندگی کا دم ہے۔ وہ کتاب مقدس کا پڑھنا بہت ضروری خیال نہیں کرتے تھے لیکن مشناہ کا پڑھنا احسن شمار کرتے تھے اور گمرا کا مطالعہ بہترین نیکی خیال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خود قادر مطلق طالمود کے مطالعہ میں شب و روز مصروف رہتا ہے!!

اس کتاب پرستی نے اُن کی عقلوں کو تاریک کر رکھا تھا۔ خداوند کا قول اُن پر صادق آتا تھا کہ "اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے تاریکی ہو تو تاریکی کیسی بڑی ہوگی"! (متی ۶: ۲۳) فریسی اپنے اندھے پن کے باعث "رحم اور انصاف، ایمان اور خدا کی محبت سے تو غافل" تھے۔ لیکن بزرگوں کی روایات کو قائم رکھنے کے لئے "سونف اور پودینہ اور زیرہ اور سداب" وغیرہ کی دہ یکی پر زور دیتے تھے۔ (متی ۲۳: ۲۳ + لوقا ۱۱: ۴۲) وہ اندھے راہنما تھے جو اونٹ کو نگل جاتے تھے لیکن مچھر کو چھانتے تھے۔ (متی ۲۳: ۲۴) وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اُٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر لادتے تھے۔ لیکن آپ ایک اُنگلی بھی اُن بوجھوں کو نہیں لگاتے تھے (لوقا ۱۱: ۴۶) وہ کتب مقدسہ کے نہایت معمولی اور ہلکے احکام کو اپنی روایات سے شدید اور بھاری بنا دیتے تھے۔ مثلاً حکم تھا کہ بنی اسرائیل "اپنے پیراہنوں کے کناروں کو جھالر لگائیں۔ اور آسمانی رنگ کا ڈورا اس پر لگائیں"۔ تاکہ آسمانی رنگ کا ڈورا دیکھ کر وہ آسمانی حکموں کو یاد کیا کریں۔ (گنتی ۱۵: ۳۷) فقیہوں نے اُس آسان حکم کے گرد باریک قیود

کی باڑیں لگادیں اور حکم دیا کہ ہر اسرائیلی پر فرض ہے کہ ہر وقت اور بالخصوص صبح کی دُعا کے وقت دو تعویذ باندھے۔ ایک بائیں ہاتھ کی کہنی پر کیونکہ وہ دل کے نزدیک ہے۔ اور دُوسرا دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر باندھے تاکہ عقل کی نشست گاہ کے قریب رہے۔ سر کا تعویذ کالے بچھڑے کے چمڑے کا ہو۔ اور اُس کے اندر چار خانے ہوں۔ جن میں خرُوج ۱۳: ۱-۱۰ + ۱۳: ۱۱-۱۶ + اِستثنا ۶: ۴-۹ + ۱۱: ۱۳-۲۱ لکھے ہوں۔ یہ آیات بچھڑے کی دُم کے بالوں سے صرف باندھی جائیں۔ تعویذ کے باہر دائیں بائیں حرف شین عبرانی زبان میں لکھا ہو۔ کیونکہ اِس حرف سے خُدا کا نام "شدّائی" یعنی قادرِ مطلق شرُوع ہوتا ہے۔ کہنی والے تعویذ میں صرف ایک خانہ ہو۔ جس میں مذکورہ بالا چار مقامات چار متوازی قطاروں میں لکھے ہوں۔ اور ہر قطار میں سات سطریں ہوں۔ تعویذ خاص طریقہ سے باندھا جائے۔ پہلے اس کی ڈوری تین دفعہ بازُو کے گرد باندھی جائے اور پھر گانٹھ دی جائے۔ اِس کے بعد ڈوری سات دفعہ مروڑی جائے اور پھر آخری گانٹھ دی جائے۔ باندھنے کے ہر عمل کے وقت کے لئے خاص دُعائیں مُقرّر تھیں۔ ان تعویذوں پر اِس قدر زور دیا گیا کہ ربی کہتے تھے کہ خُدا تعالےٰ خُود یہ تعویذ پہنتا ہے! کیونکہ لکھا ہے کہ "مَیں اپنی ہتھیلی اُٹھاؤنگا۔ اور تو میرا پیچھا دیکھیگا"۔ (خرُوج ۳۳: ۲۳)! اِس طرح یہودی ربّی مبالغہ کر کے نہایت معمُولی احکام کو "بھاری بوجھ" بنا دیتے تھے۔ اُن کا مقولہ تھا کہ اگر کوئی شخص کہے کہ جھالر لگانے کا حکم توراۃ میں نہیں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ وہ صرف کتابِ مُقدّس کے الفاظ کی بے حُرمتی کرتا ہے۔ جن میں بعض ہلکے اور دیگر بھاری ہیں لیکن اگر کوئی شخص

یہ کہے کہ تعویذ میں چار خانوں کی بجائے پانچ ہونے چاہئیں تو وہ مستوجب سزا ئے قتل ہوگا۔ کیونکہ وہ ربیّوں کے الفاظ کی بے حرمتی کرتا ہے۔ جو سب کے سب بھاری ہیں۔ کیونکہ لکھا ہے۔ کہ "جو کوئی باڑ کی جھاڑی کو توڑتا ہے۔ اُس کو سانپ ڈس جائیگا"۔ (ایکلی ۱۰: ۸)

عوام الناس ان احکام کے مارے سہم جاتے تھے۔ بقول شخصے

ع جاؤ ہوتا ہے اور بھی خفقان
سُن کے ناصح جناب کی باتیں

ظاہر ہے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کے نزدیک اگر خدا کے احکام بزرگوں کی روایات پوری کرنے میں رکاوٹ کا باعث ہوتے تو اُن الہٰی احکام کو بالائے طاق رکھ دینے میں یہودی ربیّوں کو مطلق باک نہ تھا۔ (مرقس ۷: ۱۱+ متی ۲۳: ۱۶-۲۲) وہ کہتے تھے کہ ربیّوں کے اقوال انبیاء کے اقوال سے زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ کیونکہ لکھا ہے "وہ اُن کو جو نبوّت کرتے ہیں کہتے ہیں۔ کہ نبوّت مت کرو۔ وہ (یعنی ربی) نبوّت کرینگے"۔ (میکا ۲: ۶ و ۱۱) کیونکہ انبیاء اور ربّی دو قاصدوں کی مانند ہیں۔ جن کو کوئی بادشاہ کسی صوبہ دار کی طرف بھیجے۔ ایک کی نسبت بادشاہ کہتا ہے کہ جب تک وہ اُس کی دستار اور انگشتری نہ دکھائے اُس کی مت سُنو۔ اور دوسرے کی نسبت حکم دیتا ہے کہ اُن کی بغیر کسی ظاہری نشان کے سُنو۔ اِسی طرح انبیاء کی نسبت تو خدا فرماتا ہے کہ وہ "کوئی نشان یا معجزہ دکھائے"۔ (استثنا ۱۳: ۱) لیکن ربیّوں کی نسبت خدا فرماتا ہے کہ شریعت کے فیصلے کے موافق جو وہ تجھے سکھائیں اور اُس حکم کے مطابق جو وہ تجھے دیں کر اور اُس فیصلے سے جو وہ تجھ پر ظاہر کریں دہنے

یا بائیں مت مُڑ۔" (استثنا ۱۷: ۱۱) جس سے ظاہر ہے کہ ربیّوں نے الٰہی معرفت کی کُنجی چھین لی تھی۔ وہ خُود داخل نہیں ہوتے تھے۔ اور داخل ہونے والوں کو بھی روکتے تھے"۔ (لوقا ۱۱: ۵۲) کلمتہ اللہ ان تمام باتوں مثلاً طہارت۔ غسل۔ ظاہری رسُوم کی ادائیگی۔ اور بزرگوں کی روایات وغیرہ وغیرہ کو لاحاصل اور اُن کے سرانجام دینے کو سعی باطل تصور فرماتے تھے۔ آپ کی یہ تعلیم تھی۔ کہ خُدا ظاہری افعال کو نہیں دیکھتا بلکہ اندرُونی جذبات کو دیکھتا ہے جو اُن افعال کے محرک ہوتے ہیں۔ آپ نے باطنی جذبات کو مُقدّم اور ظاہری افعال کو مؤخر قرار دے دیا۔ فریسیوں کے ظاہری اعمال پرہیزگاروں متقیوں اور پارساؤں کے سے تھے۔ لیکن یسعیاہ نبی کا کلام اُن پر صادق آتا تھا کہ "یہ اُمّت زبان سے تو میری عزّت کرتی ہے۔ مگر اُن کا دل مجھ سے دُور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں"۔ (یسعیاہ ۲۹: ۱۳ متی ۱۵: ۷) وہ شرعی الفاظ کے ایسے گرویدہ تھے۔ کہ اُن رُوحانی حقائق کو فراموش کر گئے۔ جو اِن الفاظ میں ملبُوس تھے۔ اُنہوں نے ظاہرداری اور احکام کی بجاآوری کو تو پیش نظر رکھا۔ لیکن الٰہی منشا کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ عرفی ایک قصیدے میں ایسے لوگوں کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

۵۔ خرد در آدمی۔ ونگہ تو شان قدو رخ سنجی
ہُما در آشیاں ونگہ تو فرّ آشیاں بینی
بہ خون آلودہ دست و تیغ غازی ماندہ بے تحسین
تو اوّل زیب اسپ و زینتِ برگستواں بینی

(ا) سبت کے احکام :-

موسوی شرع میں حکم تھا۔ کہ "تو سبت کا دن پاک رکھنے کے لئے یاد کر۔ چھ دن تک تو محنت کر کے اپنے سارے کام کاج کر۔ لیکن ساتواں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے۔ اس میں کچھ کام نہ کر"۔ (خروج ۲۰: ۸-۱۰) الٰہی منشا اس صحت بخش حکم سے یہ تھا کہ انسان اپنی مدت العمر پیٹ کی غلامی میں نہ کاٹے بلکہ جسم اور روح دونوں کو آرام دے۔ اور اس حقیقت کو محسوس کرے۔ کہ "انسان فقط روٹی ہی کھانے سے جیتا نہیں رہتا ہے۔ بلکہ ہر بات سے جو خداوند کے منہ سے نکلتی ہے جیتا رہتا ہے"۔ (استثنا ۸/۳) فریسیوں نے اس الٰہی منشا کو تو پس پشت پھینک دیا اور حکم کی ظاہری بجا آوری میں اس قدر مبالغہ کیا۔ اور اس حکم کو بزرگوں کی روایات کی زنجیروں میں اس قدر جکڑا کہ اس حکم کا ماننا وبالِ جان ہو گیا۔[۹] سبت انسان کی خاطر نہ رہا بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان سبت کو ماننے کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ اہلِ یہود کے نزدیک سبت کا حکم اس قدر زبردست تھا۔ کہ خدا اس کو آسمان پر مانتا تھا۔ (یوبلی ۲: ۱۸) پس حکم تھا۔ کہ جو سبت نہ مانے وہ جان سے مارا جائے۔ (گنتی ۱۵: ۳۵) سبت کے روز آگ جلانا۔ روٹی پکانا۔ گوشت اُبالنا۔ لکڑیاں جمع کرنا وغیرہ سب ممنوع تھے۔ (خروج ۳۵: ۳+ گنتی ۱۵: ۳۲)

عہد عتیق کی کتب کے لکھے جانے کے بعد فقیہوں نے "کام" کو ایک کم چالیس مختلف انواع میں تقسیم کر دیا۔ ہر نوع کے ماتحت ایک کم چالیس "کام" تھے۔ ذیل میں ان انتالیس انواع میں سے چند درج کی جاتی ہیں :-

(۱) بیج بونا
(۲) چرخہ کاتنا
(۳) دو رسیوں کا بٹنا
(۴) دو دھاگوں کا جدا کرنا

(۵) آگ بجھانا (۶) بوجھ اُٹھانا۔
(۷) گانٹھ کا کھولنا (۸) دو خط لکھنا وغیرہ

اِن مختلف انواع میں سے ہر نوع اُنتالیس کاموں پر مشتمل تھی۔ مُشتے نمونہ از خروارے اِن "کاموں" کی مثالیں یہ ہیں۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ کوئی درزی جمعہ کی شام کو سوئی اپنے پاس نہ رکھے۔ تاکہ وہ بھول کر کہیں سبت کے روز بھی (جو جمعہ کی شام سے شروع ہو جاتا تھا) اُس سوئی کو نہ اُٹھاتا پھرے۔ گوشت اور پیاز اور انڈے جمعہ کی شام سے پہلے بھون لینے چاہئیں۔ چراغ کو شفق سے پہلے جمعہ کی شام کو جلا لینا چاہیئے۔ کسی شخص کو سبت کے روز نصف میل سے زیادہ چلنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کسی کے دانت میں درد ہوتا تو سبت کے روز اُس کو کلی کرنے کی ممانعت تھی۔ کسی بیمار کو جب تک وہ قریب المرگ نہ ہو۔ علاج کرانے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کسی بچے کو چوٹ لگے اور اُس کی ہڈی ٹوٹ جائے یا ہڈی اپنی جگہ سے سرک جائے تو حکم تھا کہ جب تک جان کا خطرہ نہ ہو اُس کو کسی قسم کی امداد نہ دی جائے۔ حکم تھا کہ کوئی عورت سبت کے روز اپنا مُنہ آئینہ میں نہ دیکھے۔ کیونکہ خدشہ تھا کہ اگر اُس کو کوئی سفید بال دکھائی دے تو اُس کو اُکھاڑنے کی آزمائش میں نہ گر کر بال کو اُکھاڑنے کا کام نہ کرے۔ سبت کے روز مچھر مارنا منع تھا۔ چارپائی سبت کے روز اُٹھانی منع تھی۔ حکم تھا کہ اگر کوئی شخص سبت کے روز کسی شارع عام سے کوئی چیز اُٹھا کر گھر لائے۔ یا گھر سے اُٹھا کر کسی شارع میں لے جائے تو جماعت سے خارج اور سنگسار کیا جائے۔ اگر سبت کے روز کسی شخص کے کان سے روئی گر پڑے تو وہ اُس کو اُٹھا کر کان میں نہ ڈالے۔ کیونکہ یہ بوجھ کا اُٹھانا ہو گا۔ اگر کسی شخص کے مصنوعی دانت مُنہ میں سے گر پڑیں تو

اُن کو اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھنا بوجھ کا اُٹھانا ہوگا۔ اِس طرح احکام کی بال کی کھال نکالی جاتی۔ اور مختلف یہودی ربّی مختلف فتاوی صادر کرتے۔ مثلاً اگر کسی کا حیوان گڑھے میں گر پڑے تو بعض ربّی کہتے تھے۔ کہ اِس کو نکال لینے سے سبت کا حکم نہیں ٹوٹتا لیکن بعض کو تو ایسا سودا ہو گیا تھا کہ وہ کہتے تھے کہ چونکہ حیوان ایک بھاری بوجھ ہے۔ لہٰذا وہ سبت کے روز گڑھے سے نہ نکالا جائے۔ بلکہ اُس کے نیچے بھوسی وغیرہ ڈال دی جائے تاکہ وہ ڈوبنے سے محفوظ رہے۔ اور اُس کو خوراک وہیں دی جائے۔ فریسیوں کے احکام ایسے سخت تھے کہ کوئی شخص سبت کے روز اپنی جان بچانے کی خاطر بھی آلاتِ حرب اور اسلاح کا استعمال نہ کرے۔ خونخوار بادشاہ انٹی اوکس ایپی فینز (Anti Ochus Epiphanes) نے دوسری صدی قبل مسیح میں اس حکم کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر ایک ہزار غیر مسلّح یہود کو سبت کے روز تہ تیغ کر دیا تھا۔

صدوقی سبت کے معاملہ میں فریسیوں سے بھی زیادہ سخت تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر کوئی آدمی سبت کے روز گڑھے میں گر پڑے تو وہ ہرگز نہ نکالا جائے۔ وہ اُن قیود کے اِس قدر پابند تھے۔ کہ اُن کا حکم تھا کہ کسی اِنسان کو سبت کے روز گڑھے میں سے نکالنے کے لئے سیڑھی اور رسّہ بھی نہ لٹکایا جائے۔[۱۲] یہودی عالم مونٹی فیوری اِس امر کا اقرار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہودی ربّی بڑی مسرّت کے ساتھ سبت کے حکم کی بابت نہایت باریک بینی سے کام لیتے تھے۔ اُن کے ذہنِ رسا کو بہت دُور کی سوجھتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سبت کے گرد لامحدود چھوٹی ادنیٰ ایچ اور بے مایہ قیود کا جمگھٹا بندھ گیا۔[۱۳]

کلمتہ اللہ نے یہ تعلیم دی کہ احکام کی بجا آوری میں کسی حکم کے الفاظ کو نہیں۔ بلکہ اُس الٰہی منشا کو مدِنظر رکھنا چاہیئے۔ جس کی وجہ سے وہ حکم دیا گیا تھا۔ احکام کے محض الفاظ پر عمل کرنے سے ان کا اصلی منشا فوت ہو جاتا ہے۔ ہم کو صرف وہ رُوحانی حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیئے جو اُن احکام کی علّت غائی ہے۔ (استثنا ۵: ۱۲و۱۵+ متی ۱۵: ۳-۲۰+ ۲۳: ۱۳-۳۳)
چنانچہ آپ کی تعلیم کے مطابق انسان کی خیر خواہی اور ہمدردی احکام کے محض الفاظ کی بجا آوری پر مقدّم ہے +

اناجیل میں چھ ایسے موقعوں کا ذکر ہے جب سبت کی قیود کی بابت کلمتہ اللہ میں اور فریسیوں میں کشمکش ہوئی۔ آپ نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ "سبت انسان کی خاطر بنا ہے نہ کہ انسان سبت کی خاطر" (مرقس ۲: ۲۷) اور یہی سبت کے حکم کا حقیقی منشا تھا۔ کہ انسان اپنی روزانہ محنت سے فارغ ہو رُوحانی قواء کی نشوونما حاصل کرسکے۔ اور اپنے پروردگار اور خدا کے ساتھ رفاقت رکھ سکے۔ لیکن جب عبادت خانوں میں سبت کے روز یہودی جمع ہوتے تھے۔ تو وہاں دُعا یا نماز وغیرہ نہیں ہوتی تھی[۱۲]۔ کیونکہ عبادت خانوں کا اصلی مقصد نماز اور دُعا نہیں تھا۔ بلکہ شریعت کی تعلیم تھی۔ یہودی ربیوں نے عبادتخانوں کو درسگاہیں بنا رکھا تھا۔ پس دینی اور دُنیاوی نقطۂ نگاہ سے سبت کا روز لوگوں کے لئے وبالِ جان ہو گیا تھا۔ اِس سبت پرستی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یہودی ربی سخت دل ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے۔ کہ سبت کے روز کسی مریض کو جب تک وہ قریب المرگ نہ ہو تندرست کرنا روا نہیں۔ (لوقا ۶: ۶+ مرقس ۳: ۲) اِس سے ہم اُن کی سخت دلی اور بے رحمی کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ اِسی سخت دلی

کی وجہ سے خداوند اُن سے خفا ہوتے تھے۔ آپ نے اُن سے دریافت کیا "کیا سبت کے دِن نیکی کرنی روا ہے یا بدی؟ جان کو بچانا یا قتل کرنا؟ (مرقس ۳: ۴) جب اُنہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ تو آپ نے "اُنکی سخت دلی کے سبب غمگین ہو کر چاروں طرف غصّے سے نظر کرکے" (مرقس ۳: ۵) اُن سے پوچھا "تم میں سے ایسا کون ہے۔ جس کی ایک ہی بھیڑ ہو اور وہ سبت کے دِن گڑھے میں گر جائے۔ اور وہ اُسے پکڑ کر باہر نہ نکالے؟ پس آدمی کی قدر تو بھیڑ سے بہت زیادہ ہے۔ اِس لئے سبت کے دن نیکی کرنی روا ہے" (متی ۱۲: ۱۱-۱۲) کلمتہ اللہ کا غصّہ ایسے مذہبی پیشواؤں پر بھڑکتا تھا جو مذہب کی آڑ میں سنگدلی کو جائز قرار دیتے تھے۔ اور مذہبی اصُول کو اپنی بیرحمی کے لئے جائے پناہ بنا کر مسرت حاصل کرتے تھے۔ اور دین کی آڑ میں ذاتی منفعت کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایک موقعہ پر "عبادت خانہ کے سردار نے اس لئے کہ خُداوند نے سبت کے دِن شفا بخشی لوگوں سے خفا ہو کر کہا۔ چھ دِن ہیں جن میں کام کرنا چاہیئے۔ پس اُنہی میں آکر شفا پاؤ نہ کہ سبت کے دِن"۔ (لوقا ۱۳: ۱۴) جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مریض خُداوند کے پاس غروب آفتاب کے بعد شفا پانے آتے تھے۔ جب کلمتہ اللہ کے اِس رویہ کے باعث فریسی حلقوں میں قیامت صغریٰ برپا ہوگئی۔ تو آپ نے فریسیوں کو مخاطب کرکے فرمایا "تم میں سے ایسا کون ہے جس کا گدھا۔ یا بیٹا یا بیل کنوئیں میں گر پڑے اور وہ سبت کے دِن فوراً نہ نکال لے" (لوقا ۱۴: ۵) آپ نے فرمایا کہ خُدا سبت کے روز بھی کام کرتا ہے اُس کی پروردگاری سبت کے روز بند نہیں ہو جاتی (یُوحنا ۵: ۱۷) پس سبت کے آرام کا مطلب بے شغلی۔ کاہل الوجودی اور سستی نہیں اور نہ کھانا پینا نفیس

کپڑے پہننا اور ناچ رنگ میں مشغول رہنا ہے۔ جو یہود کا سبت کے روز معمول تھا۔ اور جس کو وہ یسعیاہ ۵۸: ۱۳ کی رُو سے صحیح خیال کرتے تھے۔ بلکہ سبت کا مطلب یہ ہے۔ کہ اُس دن وہ کام کئے جائیں جو خدا کو پسند ہوں۔ یہی وجہ تھی۔ کہ آپ نے فرمایا کہ سبت کے روز "میرا باپ کام کرتا ہے۔ اور میں بھی کام کرتا ہوں"۔ (یوحنا ۵: ۱۷) پس آپ فرماتے تھے۔ کہ آپ "سبت کے مالک" ہیں۔ (مرقس ۲: ۲۸)

(ب) حرام حلال خوراک اور اشیا:۔

بزرگوں کی روایت کو سرانجام دینے کے لئے اور ظاہری رسوم کی ادائیگی کو برقرار رکھنے کے لئے فریسی ظاہری پاکیزگی اور طہارت پر زور دیتے تھے۔ پاک اور ناپاک خوراک کے قوانین ہم کو احبار باب گیارہ اور استثنا ۱۴: ۱-۲۱ میں ملتے ہیں۔ لیکن اہل یہود کو ہمیشہ یہ خدشہ دامنگیر رہتا تھا۔ کہ مبادا وہ اپنے روزانہ کاروبار میں کسی ناپاک شے کو چھو کر ناپاک نہ ہو گئے ہوں۔ پس عالم شرع غسل و طہارت کے قوانین کو حجی ۲: ۱۲-۱۳ سے استخراج کر کے اُن پر بڑا زور دیتے تھے۔ (یوحنا ۲: ۶) مثلاً اگر کوئی شخص سارا دن گھر میں بیٹھنے کی بجائے بازار جاتا۔ تو جب واپس آتا تو اپنے ہاتھ ضرور دھوتا۔ کیونکہ وہ یہ خیال کرتا تھا کہ ممکن ہے کہ اُس کے ہاتھوں نے کسی ناپاک شے یا شخص کو چھو لیا ہو۔ نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ جس پانی سے جسم کو پاک جائے وہ خود بالکل پاک ہو۔ کامل پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے پانی خاص طرز سے مختلف اعضا پر ڈالا جاتا۔ جس طرح اہل اسلام وضو خاص طریقہ سے کرتے ہیں۔ اور یہ امور مذہبی فرائض

شمار کئے جاتے تھے۔ طالمود کا ایک پورا باب ان ہدایات سے بھرا پڑا ہے اور دو مستقل رسالے غسل کے اور ہاتھ دھونے سے تعلق رکھتے ہیں ظاہری پاکیزگی کا سودا یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ مختلف اشیا بھی دھوئی جاتی تھیں کہتے ہیں۔ کہ جب ربی عقیبہ آخری قید بھگت رہا تھا تو اُس کا ایک شاگرد اُس کے لئے دھونے اور پینے کے لئے پانی لایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ داروغۂ جیل کو جو پیاس لگی۔ تو وہ آدھا پانی پی گیا۔ اس پر شاگرد نے عقیبہ کو کہا کہ ربی۔ آپ کو شدت کی پیاس لگی ہے۔ اور آپ کے پاس پانی کم ہے آپ ہاتھ نہ دھوئیں۔ اور پانی سے اپنی پیاس بجھائیں۔ اس پر ربی عقیبہ نے جواب دیا کہ جو شخص بغیر ہاتھ دھوئے روٹی کھاتا ہے۔ وہ مستوجب قتل ہے۔ پیاس کی موت مرنا بزرگوں کی روایات کو توڑنے سے ہزار درجہ بہتر ہے"۔ فریسیوں میں ظاہری پاکیزگی کا سودا اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ مختلف اشیا کو بھی دھویا کرتے تھے۔ صدوقی مذاقیہ کہا کرتے تھے کہ یہ فریسی تب چین لیں گے۔ جب وہ آفتاب کو بھی دھو کر پاک کرینگے۔ ان یہودی ربیوں کے مطابق آسمان کی ہوا بھی پاک نہ تھی۔ کیونکہ اگر ہوا غیر اقوام کے کسی ملک سے ارضِ مقدس کی طرف چلتی تو وہ بھی ناپاک تصور کی جاتی۔ جو راستبازوں کے پھیپھڑوں کے اندر جانے کے لائق نہ تھی۔ انہی امور کی طرف اشارہ کرکے انجیلی وقائع نگار لکھتا ہے کہ "فریسی اور سب یہودی بزرگوں کی روایت پر قائم رہنے کے سبب جب تک اپنے ہاتھ کہنی تک دھو نہ لیں نہیں کھاتے۔ اور بازار سے آکر جب تک غسل نہ کرلیں نہیں کھاتے اور بہت سی اور باتیں ہیں جو قائم رکھنے کے لئے بزرگوں سے اُنہیں پہنچی ہیں۔ جیسے پیالوں اور لوٹوں اور تانبے کے

برتنوں کا دھونا (مرقس ۷: ۳-۴)

کلمتہ اللہ نے یہ تعلیم دی کہ کوئی شخص کسی "ناپاک" شے کو چھونے یا کھانے سے ناپاک نہیں ہو جاتا۔ حقیقی راستبازی محض جسمانی غسل کرنے اور "ناپاک" خوراک کو ترک کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ باطنی پاکیزگی "پیالوں اور لوٹوں اور تانبے کے برتنوں کے دھونے" سے حاصل ہو سکتی ہے۔ آپ نے یہ اصول قائم کیا۔ کہ "کوئی چیز باہر سے آدمی میں داخل ہو کر اُسے ناپاک نہیں کر سکتی۔ مگر جو چیزیں آدمی کے اندر سے نکلتی ہیں وُہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں"۔ (مرقس ۷: ۱۵) کیونکہ "جو کچھ مُنہ میں جاتا ہے وہ پیٹ میں پڑتا اور پائخانے میں نکل جاتا ہے مگر جو باتیں مُنہ سے نکلتی ہیں وہ دل سے نکلتی ہیں اور وُہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ کیونکہ بُرے خیال۔ خونریزیاں، زناکاریاں، حرامکاریاں، چوریاں، جھوٹی گواہیاں، بدگوئیاں دِل ہی سے نکلتی ہیں یہی باتیں ہیں جو آدمی کو ناپاک کرتی ہیں مگر بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھانا آدمی کو ناپاک نہیں کرتا"۔ (متی ۱۵: ۱۷-۲۰) اہل یہود جو ظاہری پاکیزگی اور حرام اشیاء سے نفرت رکھنے پر نازاں تھے اس اصول کو سُن کر ناراض ہو گئے کیونکہ وہ اُن کی تعلیم کے عین متضاد تھا۔ کلمتہ اللہ نے اُن کی کور باطنی اور بے بصری پر افسوس ظاہر کیا۔ اور فرمایا "وہ اندھے ہیں اور اندھوں کو راہ بتانے والے ہیں۔ اگر اندھا اندھے کو راہ بتائیگا تو دونوں گڑھے میں گر پڑینگے"۔ (متی ۱۵: ۱۴) آپ نے ظاہری اور بیرونی پاکیزگی کے پودے کو جو آسمانی باپ نے نہیں لگایا تھا بلکہ "بزرگوں کی روایتوں" نے قائم کیا تھا بیخ و بُن سے اُکھاڑ ڈالا۔ (متی ۱۵: ۱۳) کیونکہ اِن روایات سے خُدا کا اصلی منشا یعنے رُوحانی پاکیزگی فوت ہوتی نظر آتی تھی۔ حرام حلال خوراک کے

قوانین پر عمل کرنا۔ ہاتھ دھونا۔ غسل کرنا۔ بزرگوں کی روایات پر عمل کرنا نسبتاً
آسان بات تھی لیکن فروتن ہونا۔ رحیم مزاج رکھنا۔ باطنی پاکیزگی حاصل کرنا
محبت کرنا زیادہ مشکل امور تھے اور یہی باتیں خدا اُن سے چاہتا تھا۔ لیکن
فریسی اپنے بزرگوں کی روایات کی کورانا تقلید کرتے تھے اور یہ نہیں دیکھتے
تھے کہ محض ان رسومات پر عمل کرنے سے وہ الہٰی منشا کو پورا نہیں کر سکتے
بزرگوں کی روایات پر سختی کے ساتھ عمل کرنے کا بعض دفعہ یہ نتیجہ ہوتا
تھا۔ کہ شرع کے عالم' مفلسوں۔ ناداروں اور بیواؤں پر مظالم ڈھاتے
تھے۔ وہ یکی دینے کے اصول اور دیگر ایسے اصولوں پر سختی سے کاربند
ہو کر وہ "بیوہ عورتوں کے گھروں کو دبا بیٹھتے تھے"۔ (لوقا ۲۰: ۴۷)۔
حالانکہ ارشادِ خداوندی یہ تھا۔ کہ "نیکوکاری سیکھو۔ انصاف کے پیرو ہو۔
مظلوموں کی مدد کرو۔ یتیموں کی فریاد رسی کرو۔ بیوہ عورتوں کے حامی
ہو"۔ (یسعیاہ ۱: ۱۷ وغیرہ) پس فریسی اپنے ربیوں اور بزرگوں کے احکام
کو الہٰی احکام پر ترجیح دیکر اُن کو عملی طور پر منسوخ گردانتے تھے۔ بے
انصاف قاضی اور محصول لینے والے بھی لوگوں کو لوٹتے تھے لیکن ان
میں اور فریسیوں میں یہ فرق تھا۔ کہ وہ جانتے تھے کہ وہ خدا کے احکام کی
خلاف ورزی کرتے ہیں۔ لیکن فریسی شرع کی آڑ میں ربیوں کی تعلیم پر
عمل پیرا ہو کر یہ ناجائز کام کرتے تھے۔ اور اس امر کا اقبال نہیں کرتے
تھے کہ وہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ وہ "اندھے" تھے۔
(متی ۲۳: ۲۶) جو اپنی آنکھ کا "شہتیر" نہیں دیکھتے تھے لیکن محصول
لینے والوں کی "آنکھ کے تنکے" پر نظر کر کے اُن کو "گنہگار" قرار دے کر
خدا کی جماعت سے خارج کر دیتے تھے۔ وہ "اونٹ" کو تو نگل جاتے تھے۔

لیکن مجھؔ کو چھانتے تھے"۔ (متیؔ ۲۳ : ۲۴)

اسی طرح اہلِ یہود اپنے بزرگوں کی دیگر روایات پر عمل کر کے خدا کے احکام کو باطل کر دیتے تھے۔ چنانچہ کلمتہ اللہ نے اُن کو متنبہ کر کے فرمایا "خدا نے فرمایا ہے کہ باپ کی اور ماں کی عزّت کر اور جو باپ یا ماں کو بُرا کہے وہ ضرور جان سے مارا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ جو کوئی باپ یا ماں سے کہے کہ جس چیز کا تجھے مجھ سے فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ خدا کی نذر ہو چکی تو وہ اپنے باپ کی عزت نہ کرے۔ پس تم نے اپنی روایت سے خدا کا کلام باطل کر دیا" (متیؔ ۱۵ : ۴-۶) ایسے شرع کے عالموں اور معلّموں پر جو بزرگوں کی روائتوں کو صحفِ سماوی پر ترجیح دیتے تھے۔ خداوند نے افسوس ظاہر فرمایا۔ اور اُن کی روائتوں کی کم مائیگی کی حقیقت اُن پر یُوں ظاہر فرمائی۔ اور کہا۔ "تم کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدِس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر مقدِس کے سونے کی قسم کھائے تو اُس کا پابند ہو گا۔ اے احمقو اور اندھو کونسا بڑا ہے؟ سونا یا مقدِس، جس نے سونے کو مقدّس کیا؟ اور پھر کہتے ہو۔ کہ اگر کوئی قربانگاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں۔ لیکن جو نذر اُس پر چڑھی ہو اُس کی قسم کھائے تو اُس کا پابند ہو گا۔ اے اندھو! کون سی بڑی ہے؟ نذر یا قربانگاہ جو نذر کو مقدّس کرتی ہے؟ پس جو قربانگاہ کی قسم کھاتا ہے وہ اُس کی اور سب چیزوں کی جو اُس پر ہیں قسم کھاتا ہے۔ اور جو مقدِس کی قسم کھاتا ہے وہ اُس کی اور اُس کے رہنے والے کی قسم کھاتا ہے اور جو آسمان کی قسم کھاتا ہے وہ خدا کے تخت کی اور اُس پر بیٹھنے والے کی قسم کھاتا ہے۔" (متیؔ ۲۳ : ۱۶-۲۳)

(ج) قربانی

اہلِ یہود نے نذر اور قربانی کے اصول پر اس قدر زور دیا تھا کہ مذہب کی آڑ میں یہودی ربی اور صدوقی دُنیاوی مفاد کو مدِّ نظر رکھنے لگ گئے خُدا کی ہیکل میں تاجروں کی دُکانیں تھیں۔ جہاں بھیڑوں۔ بیلوں۔ کبوتروں وغیرہ کی قربانی گذراننے کے لئے خرید و فروخت ہوتی تھی۔ صدوقی اور کاہن اس تجارت سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ یہود اس خُداوندی ارشاد کو بھُول گئے تھے کہ "میں قربانی نہیں بلکہ رحم زیادہ پسند کرتا ہوں"۔ (ہوسیع ۶: ۶) جب آپ نے دیکھا کہ قربانیوں کی وجہ سے خُدا کا گھر "تجارت کا گھر" بن کر "ڈاکوؤں کی کھوہ" ہو گیا ہے۔ (یوحنا ۲: ۱۶ متی ۲۱: ۱۳) تو ابنِ اللہ کی غیرت جوش زن ہوئی۔ آپ نے "اُن سب کو نکال دیا جو ہیکل میں خرید و فروخت کر رہے تھے۔ اور صرّافوں کے تختے اور کبوتر فروشوں کی تختیاں اُلٹ دیں"۔ (متی ۲۱: ۱۲) اور فرمایا کہ "ان کو یہاں سے لے جاؤ میرے باپ کے گھر کو تجارت کا گھر نہ بناؤ"۔ (یوحنا ۲: ۱۶) خُدا نے فرمایا ہے کہ "میرا گھر سب قوموں کے لئے عبادت کا گھر ہو گا۔ لیکن تُم اُسے ڈاکوؤں کی کھوہ بناتے ہو"۔ (مرقس ۱۱: ۱۷-۱۸) خُدا کا مقصد تھا کہ غیر یہودی اقوام کے فرزند بھی اُس کے گھر میں حاضر ہو کر اُس پر ایمان لانے کا موقعہ حاصل کر کے اُس کے احسان۔ رحم اور محبت کو پہچان سکیں۔ خُدا کا حکم تھا کہ "میرا حکم ماننا قربانی چڑھانے سے اور شنوا ہونا مینڈھوں کی چربی سے بہتر ہے۔ کیونکہ نافرمانی اور جادوگری برابر ہیں۔ اور سرکشی کفر اور بُت پرستی کے برابر ہے"۔ (۱ سموئیل ۱۵: ۲۲-۲۳) خُدا نے فرمایا تھا۔ کہ "میں تیرے گھر کا بَیل

نہ لونگا نہ تیرے باڑے کا بکرا۔ کیا میں بیلوں کا گوشت کھاتا ہوں یا بکروں کا لہو پیتا ہوں۔ تو شکر گذاری کی قربانیاں خُدا کے آگے گذران"۔ (زبور ۵۰: ۹-۱۴) اُس نے بنی اسرائیل کو کہا تھا کہ "جس دن میں تمہارے باپ دادوں کو ملکِ مصر سے نکال لایا میں نے سوختنی قربانی اور ذبیحہ کی نسبت کچھ نہیں کہا اور حکم نہیں دیا۔ بلکہ اُن کو میں نے اتنا ہی کہہ کے حکم دیا کہ میری آواز کے شنوا ہو اور میں تمہارا خُدا ہونگا اور تم میرے لوگ ہو گے" (یرمیاہ ۷: ۲۲-۲۳) لیکن اس قوم کے رہنماؤں نے بزرگوں کی روائتوں پر چل کر اُن خُداوندی احکام کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور ظاہری رسُوم اور قربانیوں پہ اس قدر زور دیا۔ کہ خُدا کی برگزیدہ قوم کی عبادت کا اصلی مقصد فوت ہو گیا۔ اور غیر یہُود اقوام کو بھی خُدائے واحد کی عبادت کرنے کا موقعہ نہ دیا گیا۔

باب دوم

حقوق العباد

فصل اوّل

(۱)

نفسِ اِنسانی کا اِحترام :-

باب اوّل میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ کلمتہ اللہ نے یہ تعلیم دی ہے کہ خُدا ہمارا آسمانی باپ ہے۔ جو اپنی محبت اور پروردگاری کی وجہ سے ہر فرد بشر کی خوراک، پوشاک اور دیگر حاجات کا اِنتظام کرتا ہے۔ آپ اس دُنیا میں پہلے معلّم تھے۔ جس نے رُوئے زمین کی اقوام کو اِنسانی زندگی اور رُوح کی قدر و وقعت کا سبق سکھایا +

کلمتہ اللہ کی بعثت سے پہلے اِنسان کی بطور ایک خُود مختار فرد کے کوئی ہستی نہ تھی۔ انسانی تاریخ میں پہلے پہل قبیلہ ایک ہستی تصور کیا جاتا تھا۔ اور کسی فرد کی وقعت محض اس قبیلے کے ممبر ہونے کی وجہ

سے ہوتی تھی۔ مثلاً وحشی اقوام میں قبیلے کی ہستی اور بقا اس کے ہر ممبر کا مقدّم نصب العین تھا۔ اس کی اپنی ہستی کچھ نہیں ہوتی تھی۔

دوسری ارتقائی منزل میں ہر فرد کسی مُلک یا ریاست کا ممبر ہوتا تھا جس کی اپنی ذاتی ہستی کچھ نہ تھی۔ مثلاً افلاطون کے فلسفہ میں ملکی ریاست کی بہبودی ہر شخص کے لئے اعلیٰ ترین مطمحِ نظر ہے۔

تیسرے ارتقائی مرحلے میں انسان کسی خاص ذات یا خاندان کا شریک تصور کیا جاتا تھا۔ اور اس کی ہستی کی قدر و منزلت اس شراکت کے ساتھ وابستہ ہوتی تھی۔ مثلاً اہلِ ہنود کے درمیان ذات پات کا سلسلہ ہے اگر کوئی شخص اچھوت ذات کا ممبر ہے۔ تو خواہ اس کی ذاتی زندگی کیسی ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو۔ وہ ناپاک اور اچھوت خیال کیا جاتا ہے۔

چوتھی ارتقائی منزل میں انسان کی قدر و منزلت اس کی اپنی ذات پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کی قدر اور وقعت کسی خاص قبیلے یا مُلک یا ذات یا خاندان کے ممبر ہونے کی حیثیّت سے نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کے اپنے خیالات، جذبات، اقوال اور افعال کی وجہ سے ہوتی ہے۔

کلمۃ اللہ نے تاریخ عالم میں پہلی دفعہ نفسِ انسانی کی وقعت و احترام کا سبق دُنیا کو سکھایا۔ آپ سے پہلے ستوئیکی فلاسفہ کو کسی حد تک اور اپکوریئن فلاسفہ کو اور اسیری کے بعد اہلِ یہود کو اس حقیقت کی جھلک ملی تھی چنانچہ اِن لوگوں کی تصنیفات میں نفسِ انسانی کی قدر و منزلت کا ذکر بھی کہیں کہیں آیا ہے۔ مثلاً عہد عتیق کی کُتب میں خُدا کے لئے لفظ "باپ" کہیں کہیں آیا تھا۔ لیکن وہاں لفظ "فرزند" اسرائیل کی تمام قوم کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ (خروج ۴: ۲۳۔ یسعیاہ ۱: ۲۔ ہوسیع ۱۱: ۱ وغیرہ)

اسرائیل کے کسی فرد کے لئے لفظ "فرزند" کبھی استعمال نہیں ہوا۔ کیونکہ خدا تمام قوم اسرائیل کا "باپ" تصور کیا جاتا تھا نہ کسی خاص فرد کا لیکن کلمتہ اللہ نے فرمایا کہ خدا دُنیا کے ہر فرد کا باپ ہے۔ جو ہر فرد بشر سے لازوال محبت رکھتا ہے۔ کلمتہ اللہ سے پہلے کسی شخص نے بھی اس حقیقت پر ایسا زور نہیں دیا جیسا اناجیل میں دیا گیا ہے۔ آپ نے اس حقیقت کو حقوق العباد کا بُنیادی پتھر قرار دیا۔ آپ کا راحت افزا پیغام ہر فرد بشر کے لئے تھا۔ تاکہ ہر ایک انسان کی نجات ہو جائے۔ آپ اس لئے آئے۔ تاکہ ہر شخص زندگی پائے اور کثرت سے پائے۔ (یوحنا ۶: ۳۵ + ۱۷: ۶ وغیرہ) آپ نے فرمایا کہ آسمانی باپ کی محبت ہر فرد بشر پر حاوی ہے۔ اس پروردگار عالم کے ہاں ہر شخص کے ہاں بال تک گنے ہوئے ہیں۔ (متی ۱۰: ۳۰) اس کی مرضی کے بغیر بنی نوع انسان میں سے کسی ایک شخص کی زندگی میں بھی کوئی واقعہ خواہ وہ کیسا ہی خفیف کیوں نہ ہو پیش نہیں آتا۔ کلمتہ اللہ ہر شخص کو جو بنی نوع انسان کے زمرہ میں شامل ہونے کا حقدار ہو سکتا ہے بُلاتا ہے۔ (متی ۱۱: ۲۸) اور اُس کو کہتا ہے کہ اے فلاں تو خدا کا فرزند ہے اور تیری قدر نہ صرف ہوا کے پرندوں سے زیادہ ہے۔ (متی ۶: ۲۶) بلکہ تمام دُنیا سے بھی زیادہ ہے۔ (مرقس ۸: ۳۶) تیری رُوح ایک ایسی قیمتی شئے ہے۔ کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کی جان اُس کے بدلے فدیہ میں دے دی ہے۔ (متی ۲۰: ۲۸ + یوحنا ۱: ۳۰)

کلمتہ اللہ کی تعلیم کے مطابق ہر شخص کو خدا نے کوئی نہ کوئی قدرتی نعمت عطا کی ہے۔ اور ہر انسان کا فرض ہے۔ کہ جو نعمت اور خداداد قابلیت اُس کو ملی ہے اس کا وہ بہترین استعمال کرے۔ دُنیا میں جس طرح کوئی دو شخص

ایک دوسرے سے کامل طور پر شکل وصورت میں مشابہت نہیں رکھتے بلکہ ہر شخص کا خد وخال جُدا ہے۔ اسی طرح اس دُنیا میں ہر ایک شخص کو جو پیدا ہوتا ہے خُدا مختلف نعمتیں عطا فرماتا ہے۔

ع۔ ہر گُلے را رنگ و بُوئے دیگر است

کلمتہ اللہ نے فرمایا ہے کہ آسمانی باپ کی مرضی یہ ہے کہ ان خُداداد قابلیتّوں کا بہترین استعمال کیا جائے۔ اس دُنیا میں ہر شخص الگ کام کے لیئے پیدا کیا گیا ہے۔ جس کو صرف وہی احسن طور پر سر انجام دے سکتا ہے

ع ہر کسے را بہر کارے ساختند

اس کام کو ہر شخص تب ہی سر انجام دے سکتا ہے۔ جب وہ اپنی خُداداد قابلیّت کا بہترین استعمال کریگا۔ پس ہر شخص کے لیئے لازم ہے کہ وہ یہ معلوم کرے۔ کہ اُس کو آسمانی باپ نے کیا نعمت عطا فرمائی ہے اور اُس کا پروردگار نے انتظام عالم میں کیا حصّہ مقرر کر رکھا ہے (۱۔کرنتھیوں ۱۲: ۴-۱۱) وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کسی قسم کی غفلت اور کوتاہی نہ کرے۔ کلمتہ اللہ نے اس حقیقت کو ایک تمثیل کے ذریعہ اپنے شاگردوں کے ذہن نشین کیا۔ اور فرمایا کہ ایک آدمی نے "پردیس جاتے وقت اپنے گھر کے نوکروں کو بلا کر اپنا مال اُن کے سپرد کیا اور ایک کو پانچ توڑے دیئے دوسرے کو دو۔ تیسرے کو ایک۔ یعنے ہر ایک کو اُس کی لیاقت کے موافق دیا اور پردیس چلا گیا۔ جس کو پانچ توڑے ملے تھے اُس نے فوراً جاکر اُن سے لین دین کیا اور پانچ توڑے اور پیدا کر لیئے۔ اسی طرح جسے دو ملے تھے اُس نے بھی دو اور کمائے۔ مگر جس کو ایک ملا تھا اُس نے جاکر زمین کھودی اور اپنے مالک کا روپیہ چھپا دیا۔ بڑی مدّت کے بعد اُن نوکروں

کا مالک آیا۔ اور اُن سے حساب لینے لگا۔ جس کو پانچ توڑے ملے تھے۔ وہ پانچ توڑے اور لے کر آیا اور کہا "اے خُداوند تُو نے پانچ توڑے میرے سپُرد کئے تھے۔ دیکھ! مَیں نے پانچ توڑے اَور کمائے"۔ اُس کے مالک نے اُس سے کہا "اَے اچھّے اور دیانتدار نوکر۔ شاباش۔ تُو تھوڑے میں دیانتدار رہا۔ مَیں تجھے بہت چیزوں کا مختار بناؤنگا۔ اپنے مالک کی خوشی میں شریک ہو"۔ اور جس کو دو توڑے ملے تھے۔ اُس نے بھی پاس آکر کہا "اے خُداوند تُو نے دو توڑے میرے سپُرد کئے تھے۔ دیکھ مَیں نے دو توڑے اور کمائے"۔ اُس کے مالک نے اُس سے کہا "اَے اچھّے اور دیانتدار نوکر شاباش۔ تُو تھوڑے میں دیانتدار رہا۔ مَیں تجھے بہت چیزوں کا مختار بناؤں گا۔ اپنے مالک کی خوشی میں شریک ہو"۔ اور جس کو ایک توڑا ملا تھا وہ بھی پاس آکر کہنے لگا "اَے خُداوند مَیں تجھے جانتا تھا کہ تُو سخت آدمی ہے۔ اور جہاں نہیں بویا وہاں سے کاٹتا ہے۔ اور جہاں نہیں بکھیرا وہاں سے جمع کرتا ہے۔ پس مَیں ڈرا اور جاکر تیرا توڑا زمین میں چھپا دیا۔ دیکھ جو تیرا ہے وہ مَوجُود ہے"۔ اُس کے مالک نے جواب میں اُس سے کہا۔ "اَے شریر اور سُست نوکر! تُو جانتا تھا کہ جہاں مَیں نے نہیں بویا وہاں سے کاٹتا ہُوں۔ اور جہاں مَیں نے نہیں بکھیرا وہاں سے جمع کرتا ہُوں۔ پس تجھے لازم تھا کہ میرا روپیہ ساہوکاروں کو دیتا۔ تو مَیں آکر اپنا مال سُود سمیت لے لیتا۔ پس اس سے وہ توڑا لے لو اور جس کے پاس دس توڑے ہیں اُسے دے دو۔ کیونکہ جس کسی کے پاس ہے اُسے دیا جائیگا۔ اور اُس کے پاس زیادہ ہو جائیگا۔ مگر جس کے پاس نہیں ہے اُس سے وہ بھی جو اُس کے پاس ہے لے لیا جائیگا" (متی ۲۵: ۱۴—۳۰ + لوقا ۱۹: ۱۱—۲۷)

تمثیل توڑوں والی
1-7

اِس تمثیل کے ذریعہ منجیٔ عالمین نے یہ تعلیم دی کہ اگر ہم خُدا داد قابلیتوں کو خُدا کی مرضی کے مطابق اِستعمال کرینگے تو ہم خُدا کے وفادار بندے ہونگے ہم اُس عقلمند اور دیانت دار داروغہ کی طرح ہونگے جس کے مالک نے اُسے نوکر چاکروں پر مقرر کیا۔ تاکہ "ہر ایک کی خوراک وقت پر بانٹ دیا کرے۔ مُبارک ہے وہ نوکر جس کا مالک آکر اُس کو ایسا ہی کرتا پائے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں وہ اُسے اپنے سارے مال کا مختار کر دیگا۔ لیکن اگر وہ نوکر اپنے دل میں یہ کہکر کہ میرے مالک کے آنے میں دیر ہے۔ غلاموں اور لونڈیوں کو مارنا اور کھاپی کر متوالا ہونا شروع کرے تو اُس نوکر کا مالک ایسے دِن کہ وہ اُس کی راہ نہ دیکھتا ہو اور ایسی گھڑی کہ وہ نہ جانتا ہو آموجود ہوگا۔ اور خوب کوڑے لگا کر اُسے بے ایمانوں میں شامل کریگا۔ اور وہ نوکر جس نے اپنے مالک کی مرضی جان لی اور تیاری نہ کی۔ نہ اُس کی مرضی کے موافق عمل کیا بہت مار کھائیگا۔" (لوقا ۱۲: ۴۲-۴۷)

پس ہر شخص پر یہ فرض ہوگیا کہ وہ اپنی خُدا داد قابلیتوں کا بہترین اِستعمال کرے۔ کوئی شخص محض کسی قوم یا قبیلہ یا ذات کا فرد ہی نہیں بلکہ ہر اِنسان کے لئے پروردگارِ عالم نے اِنتظام عالم میں ایک گوشہ مقرر کر رکھا ہے۔ اور ایک خاص کام اُس کے سپرد کر رکھا ہے جس کو سرانجام دینے کے لئے وہ خلق کیا گیا ہے۔ خُدا نے اس کو اُس کام کو سرانجام دینے کی قابلیت اور اہلیت بھی عطا کر رکھی ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی قسمت کا مالک اور اپنے اپنے افعال کا ذمہ دار ہے اور ہر شخص اپنے کاموں کی جزا اور سزا پائیگا۔ اور منصفِ حقیقی کے سامنے اپنے خیال، قول اور فعل کا ذمہ دار ہوگا۔ (متی ۱۲: ۳۶ + ۲۵: ۳۱-۴۶) کلمۃ اللہ نے فرمایا۔ "آدمی اگر

ساری دُنیا کو حاصل کرے اور اپنی جان کا نقصان اُٹھائے تو اُسے کیا فائدہ ہوگا؟ اور آدمی اپنی جان کے بدلے کیا دے؟" (مرقس ۸: ۳۶-۳۷)

کلمتہ اللہ نے ہر فرد بشر کی قدر و منزلت پر زور دیکر بنی نوع انسان کی قدر و منزلت کو بڑھا دیا۔ اور یہی ایک امر آپ کی حقیقی عظمت کو ظاہر کرتا اور آپ کی تعلیم کی صداقت پر دلالت کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سب سے بُرا وہ شخص ہے۔ جو ادنیٰ ترین انسان کی رُوحانی ترقی میں رُکاوٹ کا باعث ہوتا ہے۔ آپ کے الفاظ نہایت وزن دار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی ادنیٰ ترین انسانوں میں سے "کسی کو ٹھوکر کھلاتا ہے۔ اُس کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک چکّی کا پاٹ اُس کے گلے میں لٹکایا جائے۔ اور وہ گہرے سمندر میں ڈبو دیا جائے۔ خبردار ان چھوٹوں میں سے کسی کو ناچیز نہ جاننا۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں۔ کہ آسمان پر اُن کے فرشتے میرے آسمانی باپ کا مُنہ ہر وقت دیکھتے ہیں۔ تُمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے یہ مرضی نہیں کہ ان چھوٹوں میں سے ایک بھی ہلاک ہو۔" (متی ۱۸: ۶ و ۱۰ و ۱۴)

بیا زارم زخود ہرگز دلے را
کہ می ترسم درد جائے تو باشد

(۳)

بچّوں کی منزلت

منجی عالمین کی بعثت سے پہلے یونانی رومی دُنیا میں بچّوں کی مُطلق پروا نہیں کی جاتی تھی۔ اسقاطِ حمل معیوب خیال نہ کیا جاتا تھا۔ ارسطو جیسے عظیم الشان فلاسفر نے اُسے نہ صرف جائز قرار دیا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہ

دیا تھا۔ کہ جب مُلک کی آبادی ایک مقررّہ حد سے تجاوز کر جائے تو اِس قاعدہ کو حکماً نافذ کرنا چاہیئے۔ مُشرک مصنّفین کی کُتب سے معلُوم ہوتا ہے کہ یہ رسم قبل از مسیح علانیہ بالعمُوم جاری تھی مثلاً ہلیریَن (Hilarium) اپنی بیوی کو ایک محبّت آمیز خط لکھتا ہے اور اِس خط کے آخر میں اِسکو نہایت عام اور سرسری طور پر ہدایت کرتا ہے کہ اگر نوزائیدہ بچّہ لڑکی ہو تو اُس کو باہر پھینک دے۔ جس سے معلُوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کوئی غیر معمُولی ہدایت نہیں دیتا۔ اِسی طرح حکیم سینیکا (Seneca) لکھتا ہے کہ "ہم کمزور اور بدصورت بچّوں کو مروا ڈالتے ہیں۔ کیونکہ ہماری عقل ہم کو بتاتی ہے۔ کہ مفید اشیا کو غیر مفید سے جُدا رکھنا چاہیئے"۔ طفل کشی کی قبیح رسم تمام یُونانی رُومی دُنیا میں رائج تھی۔ اور بغیر کسی تامل کے علانیہ کی جاتی تھی۔ متروک اولاد کی تجارت کھلم کھلی رُومی سلطنت کے کونہ کونہ میں کی جاتی تھی +

کلمتہ اللہ نے دُنیا کو بچّوں کا احترام کرنا سکھایا۔ ایک دفعہ لوگ بچّوں کو آپ کے پاس لائے تاکہ آپ "اُن پر ہاتھ رکھ کر دُعا مانگیں" (متّی ۱۹: ۱۳) لیکن آپ کے حواریوں نے اُن کو روکا۔ آپ یہ دیکھ خفا ہوئے اور فرمایا کہ "بچّوں کو میرے پاس آنے دو اور اُنہیں منع نہ کرو۔ کیونکہ خُدا کی بادشاہت ایسوں ہی کی ہے۔ مَیں تُم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کوئی خُدا کی بادشاہت کو بچّے کی طرح قبول نہ کرے۔ وہ اُس میں ہرگز داخل نہ ہوگا" (لُوقا ۱۸: ۱۵-۱۷) آپ نے بچّوں کو "اپنی گود میں لیا۔ اور اُن پر ہاتھ رکھ کر اُنہیں برکت دی"۔ (مرقس ۱۰: ۱۶) +

ایک دفعہ مُنجی عالمین نے ایک بچّہ کو لے کر حواریوں کے درمیان کھڑا کیا اور اُسے گود میں لے کر (مرقس ۹: ۳۶) شاگردوں کو فرمایا کہ "اگر تم نہ پھرو

اور بچّوں کی مانند نہ بنو تو آسمان کی بادشاہت میں ہرگز داخل نہ ہو گے۔ جو کوئی میرے نام پر ایسے بچّوں میں سے کسی کو قبول کرتا ہے وہ مجھے قبول کرتا ہے اور جو کوئی مجھے قبول کرتا ہے وہ مجھے نہیں بلکہ اُسے جس نے مجھے بھیجا قبول کرتا ہے لیکن جو کوئی اِن چھوٹوں میں سے جو ایمان لائے ہیں کسی کو ٹھوکر کھلاتا ہے۔ اِس کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک بڑی چکی کا پاٹ اِس کے گلے میں لٹکایا جائے اور وہ گہرے سمندر میں ڈبو دیا جائے۔" (متی ۱۸: ۳ - ۶+۱۷: ۳۰) "کیونکہ تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے یہ مرضی نہیں کہ اِن چھوٹوں میں سے ایک بھی ہلاک ہو" (متی ۱۸: ۱۴)۔

کیا بچّوں کے نفس کا احترام اِن سے زیادہ پُرزور اور روشن الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے؟ پس جائے تعجب نہیں کہ چھوٹے بچّے اور لڑکے آپ پر فدا تھے۔ اور ہر جگہ آپ کا استقبال بڑے تپاک سے کرتے تھے۔ (متی ۱۹: ۱۵)

(۳)

حُرمتِ نسواں:-

یُونانی رُومی دُنیا میں عورتوں کی حیثیّت نہایت پست تھی۔ یُونانی بیویوں کی مُدّت العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی۔ وہ بچپن میں اپنے والدین کی۔ جوانی میں اپنے شوہروں کی اور بیوہ ہونے پر اپنے فرزندوں کی غُلام اور تابعدار ہوتیں۔ سپارٹا کے قانون کے مطابق بوڑھے اور ضعیف القویٰ شوہروں پر لازم تھا۔ کہ وہ اپنی کم سن بیویاں نوجوانوں کے حبالۂ نکاح میں دے دیں تاکہ فوج میں قوی سپاہیوں کی تعداد زیادہ ہو۔ رُومی قانون کے مطابق

شوہر یا باپ خاندان کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ اس کو اپنے بیوی بچوں پر کامل اختیار حاصل تھا۔ وہ جب چاہتا عورت کو اپنے گھر سے نکال سکتا تھا۔ بلکہ مابعد کے زمانہ میں تو اس کے اختیارات اس قدر وسیع ہو گئے تھے کہ اگرچہ وہ چاہتا تو بیوی کو قتل بھی کر سکتا تھا۔ عورتیں فرقہ ذکور کی آلہ شہوت ہی تصور کی جاتی تھیں +

اسلام نے بھی عورتوں کی حالت ناگفتہ بہ کر رکھی ہے قرآن کہتا ہے کہ "مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ اس لئے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے"۔ (سورہ نساء) شوہر اپنی بیوی کو مار پیٹ سکتا ہے ایک کی بجائے دوسری بدل سکتا ہے (سورہ نساء) وہ عورتوں کو طلاق دے سکتا ہے لیکن عورتیں مردوں کو طلاق نہیں دے سکتیں۔ عورتیں مردوں کی کھیتیاں ہیں۔ شوہر ایک ہی وقت میں چار چار بیویاں نکاح میں لا سکتا ہے اور ان کے علاوہ لاتعداد لونڈیاں رکھ سکتا ہے۔ (سورہ نساء) +

اہلِ یہود کو احکامِ عشرہ میں یہ حکم تھا کہ "تو زنا نہ کر" (خروج ۲۰: ۱۴) لیکن ابتداء سے لیکر مسیحیت کی آمد کے بعد کے زمانہ تک بھی اس حکم کا مفہوم نہایت محدود معنوں میں سمجھا جاتا تھا۔ اہلِ یہود کے نزدیک اس حکم کے مطابق کسی منکوحہ عورت کے لئے اپنے خاوند کے علاوہ کسی غیر شخص کے ساتھ ناجائز تعلق رکھنا ہر حالت میں ممنوع تھا لیکن کسی شادی شدہ مرد کے لئے اپنی بیوی کے سوا کسی دوسری عورت کے ساتھ تعلق رکھنا صرف خاص حالات میں ہی ممنوع تھا۔ اگر کوئی شادی شدہ مرد کسی غیر منکوحہ عورت کے ساتھ ناجائز تعلق رکھتا تو وہ اس حکم کے ماتحت زناکار شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ ہاں۔ اگر کوئی شادی شدہ مرد کسی غیر شخص کی منکوحہ بیوی سے ناجائز تعلق رکھتا

تب وہ زانی شمار کیا جاتا تھا۔ اہلِ یہود کے نزدیک عورت بطور مالِ منقولہ خیال کی جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص کسی دُوسرے کی منکوحہ عورت پر ہاتھ ڈالتا۔ تو وہ پرائے شخص کی جائداد پر قبضہ کرتا تھا۔ لیکن غیر منکوحہ عورات اِس حکم سے مستثنےٰ تصور کی جاتی تھیں۔ کیونکہ وہ شادی کر کے کسی شخص کی جائداد کا حِصّہ نہیں بن چکی تھیں۔ پس ساتویں حکم کا تعلق درحقیقت ناپاکی اور شہوت پرستی کے ساتھ نہیں تھا۔ بلکہ جائداد کی چوری اور ڈاکہ زنی کے ساتھ کیونکہ عورت کا درجہ مالِ منقولہ کا تھا۔

بزرگوں کی روایات نے عورات کا یہ حال کر دیا تھا کہ یہودی ربّی شارع عام میں عورتوں سے بات کرنا تو درکنار اُن کا سلام تک قبول کرنا بھی باعثِ ننگ خیال کرتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ یہ بہتر ہے کہ شریعت کے الفاظ جلا دیئے جائیں۔ بہ نسبت اس کے کہ وہ کسی عورت کو سکھائے جائیں۔ اُن کی روزانہ عبادت میں یہ شکر بھی تھی جواب بھی عبادت خانوں میں کی جاتی ہے کہ "اے خُدا تیرا نام مبارک ہو کہ تُو نے مجھے عورت نہیں بنایا"۔ اور عورت ان الفاظ میں خُدا کا شکر کر کے کہتی تھی ہے۔ "اے خُدا میں تیرا شکر کرتی ہوں کہ تُو نے مجھے اپنی مرضی کے مطابق بنایا ہے"۔

لیکن منجیٔ عالمین نے خُود اپنی زبانِ فیض ترجمان سے ایک سامری عورت کو تعلیم دی (یوحنا ۴ باب) آپ کا نجات کا پیغام مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے یکساں تھا۔ آپ نے اپنی تعلیم میں عورتوں کا کئی دفعہ ذکر بھی کیا۔ انجیل سوم ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ آپ نے تائب گنہگار عورتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے عوض اُن کو الٰہی محبّت کا زندگی بخش پیغام سنایا۔ اور اُن کو الٰہی مغفرت کا جانفزا مژدہ دیا۔

(لوقا ۷: ۳۶-۵۰) آپ نے بے شمار عورتوں کو شفا بخشی۔ (لوقا ۸ باب وغیرہ) آپ نے بخوشی تمام اُن کی دعوت کو قبول کیا۔ (لوقا ۱۰: ۳۸-۴۲) عورتوں میں سے بعض آپ کی دلی دوست تھیں۔ (یوحنا ۱۱: ۵) "بہتیری عورتیں" آپ کے پیغامِ نجات کی اِس قدر گرویدہ تھیں کہ "اپنے مال سے" آپ کی اور آپ کے حواریوں کی "خدمت کرتی تھیں"۔ (لوقا ۸: ۳) آپ نے فرمایا کہ ہر عورت جو آسمانی باپ کی مرضی پر چلتی ہے آپ کی بہن اور ماں ہے"۔ (مرقس ۳: ۳۵)

کلمۃ اللہ کی تعلیم صنفِ نازک کے حقوق کی ہمیشہ محافظ رہی۔ اگر ہم بنی نوعِ انسان سے اپنی مانند محبت رکھینگے تو اُن کی عزت کرینگے۔ اور اُن کے رُوح اور جسم دونوں کی قدر کرینگے پس کلمۃ اللہ نے محبت کا اصول ایسا عالمگیر اور جامع مقرر کیا ہے جس نے عورتوں کی عزت اور اِن کے رُوح اور جسم دونوں کی منزلت کو ایک احسن شے قرار دیدیا۔ کوئی شخص اِس بات کو پسند نہیں کرتا۔ کہ اُس کی ماں بہن۔ بیٹی یا بہو بیوی کو صرف آلۂ شہوت بنا کر استعمال کیا جائے۔ پس محبت کے ہمہ گیر اصول کے مطابق ہم ہر عورت کو اپنی بہن بیٹی کی مانند تصور کرینگے۔ اور بُرے خیالی ناشائستہ افعال سے احتراز کرینگے۔ بلکہ عورتوں کے رُوح اور جسم کو اپنی رُوح اور جسم کی طرح قابلِ قدر جان کر اُن کی وقعت کرینگے۔

پس کلمۃ اللہ کی تعلیم نے عورتوں کو مردوں کے آلۂ شہوت ہونے سے بچا لیا اور زناکاری اور عصمت فروشی کا سدِباب کر دیا۔ ربی جلیل نے طلاق کی اجازت دے رکھی تھی۔ اُس کا قول تھا کہ "مرد عورت کو نہایت معمولی غلطیوں کی وجہ سے طلاق دے سکتا ہے۔ مثلاً جب وہ

روٹی جلائے۔ تو مرد اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ لیکن عورت کو یہ اختیار حاصل نہیں تھا۔ کہ مرد کو کسی حالت میں بھی طلاق دے سکے۔ پس طلاق کی گرم بازاری نے عورتوں کا درجہ پست کر دیا تھا۔ ان پست خیالات نے شہوت رانی کو ترقی دے رکھی تھی۔ کلمۃ اللہ نے طلاق کو قطعی طور پر بند کر دیا۔ فریسی ایک دفعہ کلمۃ اللہ کے پاس آئے۔ اور پوچھنے لگے۔ "کیا یہ روا ہے کہ مرد اپنی بیوی کو چھوڑ دے"؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ خالق کا ابتدائی منشا یہ نہیں تھا۔ کہ مرد اپنی بیوی کو طلاق دے۔ کیونکہ مرد اور عورت "دو نہیں بلکہ ایک جسم ہیں۔ اس لئے جسے خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے"۔ (مرقس ۱۰: ۱ - ۹) جب آپ کے شاگردوں نے پھر طلاق کی نسبت استفسار کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ "جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ اس پہلی کے برخلاف زنا کرتا ہے اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے"۔ (مرقس ۱۰: ۱۱ - ۱۲) پھر فرمایا۔ "جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے وہ اس سے زنا کراتا ہے۔ اور جو شخص شوہر کی چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے"۔ (متی ۵: ۳۲ + لوقا ۱۶: ۱۸)

پس کلمۃ اللہ کی تعلیم نے فرقۂ نسواں کو قعر ذلت سے نکال دیا اور عورتوں کی کایا پلٹ دی۔ یہاں تک کہ دنیائے اخلاق میں مردانہ فضائل کی بجائے نسوانی فضائل کو زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین قرار دے دیا۔ چنانچہ پروفیسر سیتھ (Seth) کہتا ہے۔ کہ "مسیحیت نے جو عظیم الشان تبدیلی دنیائے اخلاق میں پیدا کر دی۔ وہ یہ ہے کہ اس نے تنگ اور مردانہ

فضائل کی بجائے جو متقدمین کا نصب العین تھیں، نسوانی فضائل کو نیکی کا جوہر قرار دے دیا۔ ... مسیحی فضائل کا دائرہ اب میدانِ جنگ نہ تھا بلکہ اب غربا کی مدد، بیماروں کی تیمارداری اور مظلوم و متروک اولاد کی خبرگیری کرنا کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔" اسی طرح مورّخ لیکی (Lecky) بھی کہتا ہے "مسیحیت کا ایک خاص کارنامہ یہ ہے۔ کہ اس نے اخلاقی تخیّل میں تبدیلی پیدا کر کے فضائلِ نسوانی کو ایک خاص شرف و امتیاز عطا کر دیا۔ ... یہ انقلاب حالت تمام تر مسیحیت کا نتیجہ تھا۔ جس نے قدیم یونانی (اور رومی) تخیل کو فنا کر کے اس کی جگہ حلم و انکسار۔ خلق و تپاک، رفق و ملاطفت، تسلیم و رضا۔ اُلفت و محبت کے جذبات مخصوص بہ نسواں کو رفعت بخشی"[۱]

پس کلمۃ اللہ کی تعلیم صنفِ نازک کے حق میں آیۂ رحمت ہے اُس نے عورتوں کو وہ درجہ عطا کیا ہے۔ جو اِن کو کبھی نصیب نہ ہُوا تھا اور جو اب اُن سے چھِن نہیں سکتا ۞

فصل دوم

(۱)

اُخوّتِ انسانی اور مسیحی نصب العین

کلمۃ اللہ نے تعلیم دی کہ خُدا ہمارا آسمانی باپ ہے اور کُل بنی نوعِ انسان ایک دُوسرے کے بھائی ہیں۔ آپ نے فرمایا "تمہارا باپ ایک ہی ہے۔ جو

آسمان پر ہے اور تم سب بھائی ہو"۔ متی ۲۳: ۸-۹-۱۰

یہ پہلا سبق تھا کتاب ھدا کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

کلمتہ اللہ سے پہلے انبیاء اللہ نے اس اصول کی روشنی کی جھلک دیکھی تھی لیکن کلمتہ اللہ اس دُنیا میں پہلے معلم تھے۔ جنہوں نے خدا کی محبت الوہیت اور انسانی اخوت کو اپنی تعلیم کا اصل الاصول بنایا۔ متقدمین نے تو اس اصول کی ایک جھلک پائی تھی لیکن کلمتہ اللہ نے اس اصول کو انسان کی روزمرہ زندگی کے فرائض کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اور کل انسانی اخلاق کا نصب العین قرار دے دیا۔ دیگر انبیا نے اس کو دھندلے اور مبہم طور پر ہی ظاہر کیا تھا۔ لیکن خداوند نے اس اصول کو عالمگیر بنا کر اس کو کل بنی نوع انسان پر حاوی کر دیا۔ جس طرح الٰہی محبت سب پر حاوی ہے۔ اسی طرح انسانی محبت بھی کسی خاص طبقہ یا قوم سے متعلق نہیں بلکہ عالمگیر ہے۔ خداوند مسیح نے انسانی اخوت و مساوات پر نہ صرف بڑا زور دیا۔ بلکہ محبت کو اپنی تعلیم کا بنیادی پتھر بنا کر بار بار تاکید کر کے فرمایا "میں تم کو ایک نیا حکم دیتا ہوں۔ کہ ایک دوسرے سے محبت رکھو" "جیسے میں نے تم سے محبت رکھی تم بھی ایک دوسرے سے محبت رکھو اس سے سب جانیں گے کہ تم میرے شاگرد ہو"۔ (یوحنا ۱۳: ۳۴-۳۵ + ۱۵: ۱۲-۱۴)

کلمتہ اللہ نے اخلاقی قوانین کو تمام رسوم اور قیود شرعیہ سے آزاد کر کے اُن کو صرف ایک اصول یعنے اصول محبت کے ماتحت کر دیا۔ اس زریں اصول کے سوا آپ نے کوئی دوسرا اصول کبھی وضع نہ کیا۔ اور فرمایا کہ اِس اصول پر "تمام توریت اور صحائف انبیا کا مدار ہے"۔

(متی ۲۲: ۴۰) آپ کی تعلیم کے مطابق محبّت کا اصُول آسمان اور زمین پر حاوی ہے۔ آسمان پر خُدا ہے جس کی ذات اور جس کا جوہر محبّت ہے وُہی اکیلا حقیقی منعم ہے۔ اور زمین پر ایک ہی نعمت ہے۔ جو قابلِ رشک ہے اور وہ محبّت ہے جو ہم کو دُوسروں کی خدمت کرنے کا فخر عطا کرتی ہے ؎

یک منعم و یک نعمت و یک منّت و یک شکر
صد شکر کہ تقدیر چنیں راند قلم را

یہی وجہ ہے کہ مُقدّس پولُوس رسُول لکھتا ہے "آپس کی محبّت کے سوا کسی چیز میں کسی کے قرضدار نہ ہو۔ کیونکہ جو دُوسرے سے محبّت رکھتا ہے اُس نے شریعت پر پُورا عمل کیا۔ کیونکہ یہ باتیں کہ زنا نہ کر۔ خُون نہ کر۔ چوری نہ کر اور ان کے سوا اور جو کوئی حُکم ہو۔ ان سب کا خلاصہ اِس بات میں پایا جاتا ہے۔ کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ محبّت اپنے پڑوسی سے بدی نہیں کرتی اِس واسطے محبّت شریعت کی تکمیل ہے۔" (رومیوں ۱۳: ۸-۱۰)

فریسیوں نے روزمرّہ زندگی کو لاتعداد قیوُد سے جکڑ رکھا تھا جن کو وہ راستبازی کے لئے ضرُوری خیال کرتے تھے۔ زندگی ان قیود کے "بھاری بوجھ" کے مارے ایک وبال ہوجاتی ہے لیکن اگر ہمارے دل میں خُدا اور اِنسان کی محبّت موجزن ہے۔ تو زندگی بوجھ ہونے کی بجائے خُوشی اور خرمی کا باعث ہوجاتی ہے۔ اور اِس کا قُدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ان چھوٹے چھوٹے احکام کی ضرُورت ہی نہیں رہتی ہم خُود بخُود راستبازی کے ایسے کام کرینگے جو خُدا اور اِنسان کے نزدیک مقبُول ہونگے۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم کی یہ خصُوصیّت ہے کہ محبّت کے بنیادی اصُول کی وجہ سے قوانین و قواعد

یا احکام کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اگر ہماری "آنکھ درست" ہے (متی ۶: ۲۲)
تو ہماری ضمیر ہر موقع پر ہم کو بتا دیتی ہے۔ کہ آیا فلاں کام خُدا اور انسان
کی محبت کے منافی ہے یا مطابق ہے۔ کلمۃ اللہ اُن سب اشخاص کو ملامت
کرتے تھے۔ جو محبت کے اصول کا اطلاق اپنی روزمرہ زندگی کے افعال
پر نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کے دلوں میں انسانی محبت کی بجائے کسی
اور شے کی محبت حکمران ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم اور آدمیوں کے ساتھ
ایسی محبت رکھینگے۔ جیسی ہم اپنے ساتھ کرتے ہیں۔ تو اِس کا قدرتی نتیجہ یہ
ہوگا۔ کہ ہم اُن کو کسی طرح کا گزند نہیں پہنچائینگے۔ خون قتل غصّہ۔ زنا۔
شہوت پرستی۔ چوری چغل خوری۔ عیب جوئی وغیرہ کا خود بخود سدِّباب
ہو جائیگا۔ نہ صرف یہ باتیں خود بخود مٹ جائینگی بلکہ ہم ہر ایک شخص کے ساتھ جو
ہمارے دائرہ اثر میں آئیگا۔ بہترین سلوک روا رکھینگے پس کلمۃ اللہ نے لاتعداد
قوانین کی بجائے ایک زندہ اصول قائم کر دیا۔ جس پر عمل کرنے سے
ہماری زندگی سے خود بخود تمام نیک افعال صادر ہو سکتے ہیں +

کینن لڈن (Canon Liddon) ایک موقعہ پر کہتا ہے۔ کہ
اخلاقی قانون ازلی ہے لیکن انجیل شریف میں یہ اخلاقی قانون کوئی بیرونی
شکل اختیار نہیں کرتا بلکہ زندگی کا روحانی اور اندرونی اصول بن جاتا
ہے۔[۱۲] محبت ایک ایسا نصب العین ہے۔ جو جامع اور مانع ہے۔ محبت
ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم ہر ممکن طور سے یہ سر توڑ کوشش کریں کہ ہمارا
پڑوسی بھی محبت کرنے والوں کے حلقہ میں داخل ہو جائے۔ مشہور فلاسفر
پروفیسر رائس (Royce) کہتا ہے "محبت کا اوّلین کام یہ ہے کہ
دوسرے شخص میں محبت پیدا کرے۔ اور تمام لوگوں کو محبت کی تعلیم دے

کہ آسمان کی بادشاہت کی حدود کو وسیع کر دے[۱۳]۔ محبت کی چنگاری دوسرے کے دل میں بھی محبت کی آگ لگا دیتی ہے محبت سے بہتر نصب العین اور مطمح نظر عالمِ وجود یا عالمِ خیال میں آ ہی نہیں سکتا۔ جرمن شاعر گوئٹے (Goethe) نے کیا خوب کہا ہے کہ "خواہ ہمارا فہم انسانی ادراک اور روحانی ترقی کیسے ہی بڑے معراج پہ پہنچ جائیں وہ مسیح کی تعلیم کے اخلاقی جلال اور عروج سے (جس کی جھلک ہم کو اناجیل میں دکھائی دیتی ہے) آگے نہیں نکل سکتے"[۱۴]۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ مے بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

ایک عالمِ شرع نے کلمۃ اللہ سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کونسا حکم ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ "اول یہ ہے کہ تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔ دوسرا یہ ہے کہ تو اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ (مرقس ۱۲: ۳۰-۳۱) اس پر اس نے کلمۃ اللہ سے پوچھا کہ میرا پڑوسی کون ہے جس سے میں اپنے برابر محبت رکھوں؟ خداوند نے اس کا جواب ایک تمثیل میں دیا۔ اور فرمایا "ایک آدمی یروشلم سے یریحو کی طرف جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں میں گھر گیا۔ انہوں نے اس کے کپڑے اتار لئے اور مارا بھی اور ادھموا چھوڑ کر چلے گئے۔ اتفاقاً ایک کاہن اسی راہ سے جا رہا تھا۔ اور اسے دیکھ کے کترا کر چلا گیا۔ اسی طرح ایک لیوی اس جگہ آیا۔ وہ بھی اسے دیکھ کے کترا کر چلا گیا۔ لیکن ایک سامری سفر کرتے کرتے وہاں آ نکلا۔ اور اس نے دیکھ کر ترس کھایا اور اس کے

پاس آیا اور اُس کے زخموں کو تیل اور مے لگا کر باندھا اور اپنے جانور پر سوار کر کے سرائے میں لے آیا۔ اور اُس کی خبر گیری کی۔ دُوسرے دن دو دینار نکال کر بھٹیارے کو دیئے اور کہا اِس کی خبر گیری کرنا اور جو کچھ اِس سے زیادہ خرچ ہو گا میں پھر آ کر تجھے ادا کر دُونگا۔ اِن تینوں میں سے اُس شخص کا جو ڈاکوؤں میں گھر گیا تھا تیری دانست میں کون پڑوسی ٹھہرا اُس نے کہا وہ جس نے اُس پر رحم کیا۔ یسوع نے اُس سے کہا جا تو بھی ایسا ہی کر۔" (لوقا ۱۰: ۳۰-۳۷)۔

کلمۃ اللہ کا یہ مطلب ہے کہ اس دُنیا میں ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ دُوسرے کے ساتھ (خواہ وہ اُس کے مذہب، ملت یا طبقہ کا ہو یا نہ ہو) اپنے برابر محبت رکھے۔ آپ نے سامری کو حقیقی پڑوسی قرار دیا۔ گو سامریوں میں اور اہل یہود میں سخت مخالفت تھی۔ (لوقا ۹: ۵۴) اہل یہود کے لئے جائز نہ تھا کہ کسی سامری کی مہمان نوازی قبول کریں۔ (یوحنا ۴: ۹)۔ سامریوں کی گواہی یہودی عدالتوں میں قابل اعتبار نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہودی ربی کہتے تھے کہ "کسی سامری کی روٹی کھانی خنزیر کے گوشت کھانے کے برابر ہے" لیکن ابن اللہ نے ایک سامری کو جس کو تمام یہودی بنظر حقارت دیکھتے تھے۔ (یوحنا ۸: ۴۸) پڑوسی کا بہترین نمونہ قرار دیا۔

مساوات کی تعلیم یہود کی کتب مقدسہ میں نہ تھی۔ یہ کتابیں یہود اور غیر یہود میں قطعی طور پر تمیز کرتی تھیں۔ یہود میں بھی لفظی کے طور پر مساوات کا اصول جائز تھا۔ چنانچہ توریت نے کہا تھا "جس چیز سے تجھے نفرت ہے وہ دُوسرے کے لئے روا نہ رکھ"۔ (۴: ۱۵) ربی ہلیل نے کہا تھا کہ "جس

شئے کو تُو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اُس کو تو اپنے پڑوسی کے لیئے روا نہ رکھ۔ تمام شریعت یہی ہے۔ باقی اِس کی تفسیر ہے" [۱۶] یعنی وہ کہتے تھے کہ "ہرچہ برخود مپسندی بر دیگراں مپسند" لیکن کلمۃ اللہ نے اصُول مساوات کو یہُود اور غیر یہُود سب پر حاوی کر کے اِس اصُول کو اثباتیہ شکل دے دی اور فرمایا "جو کچھ تُم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں۔ وُہی تُم بھی اُن کے ساتھ کرو" (متی ۷: ۱۲)

پس کلمۃ اللہ اِس دُنیا میں پہلے معلّم تھے جنھوں نے اخُوّت انسانی کا سبق دُنیا کو پڑھایا۔ آپ سے پہلے کسی مِلّت کے مذہبی پیشوا نے یہ سبق نہیں دیا تھا۔ افلاطُون کا فلسفہ اگرچہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے بلند پایہ کا تھا۔ لیکن اِس میں درجہ بندی کی قیود موجُود تھیں۔ گو ستوئیقی حکما انسانی اخوّت کا دم بھرتے تھے تاہم وہ اِس تصوّر کو نباہ نہ سکے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ناصرت کے نبی نے اخوّت و مساوات کا سبق کل دُنیا کو سکھایا۔ آپ نے انسانی محبّت کو کسی خاص دائرہ یا قبیلہ یا مِلّت یا قوم تک ہی محدُود نہ رکھا بلکہ حکم دیا کہ ہر شخص دُوسرے کو بلا امتیاز قوم اور نسل اور رنگ پیار کرے۔ حتّیٰ کہ آپ نے فرمایا کہ جانی "دُشمنوں سے محبّت رکھو تاکہ تُم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو کیونکہ وہ اپنے سُورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے کیونکہ اگر تُم اپنے محبّت رکھنے والوں سے ہی محبّت رکھو تو تمہارے لیئے کیا اجر ہے اور اگر تُم فقط اپنے بھائیوں ہی کو سلام کرو تو کیا زیادہ کرتے ہو۔ پس چاہیئے کہ تُم کامل ہو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے" (متی ۵: ۴۴ تا ۴۸)

تمہاری محبت ہمہ گیر ہو۔

اِس عالمگیر محبت سے کوئی شخص مستثنےٰ نہیں کیا گیا۔ تاریخ اِس امر کی گواہ ہے۔ کہ کلمتہ اللہ کی تعلیم نے ہر طرح کی تفریق اور درجہ بندی کو مٹا دیا۔ ارسطو جیسا عظیم الشان فلاسفر غلامی کی قبیح رسم کو نہ صرف جائز بلکہ ایک قدرتی شے خیال کرتا تھا۔ منجئی عالمین کی تعلیم نے غلامی کو بھی مٹا دیا۔ غلام اور آزاد، غریب اور دولتمند، اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز دُنیا سے اُٹھ گیا۔ آپ ایک دفعہ ایک شخص کے گھر کھانا کھانے گئے۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ جب تو دِن کا یا رات کا کھانا تیار کرے تو اپنے دوستوں یا بھائیوں یا رشتہ داروں یا دولتمند پڑوسیوں کو نہ بُلا کہ ایسا نہ ہو وہ بھی تجھے بُلائیں اور تیرا بدلہ ہو جائے۔ بلکہ جب تو ضیافت کرے تو غریبوں، لُنجوں، لنگڑوں، اندھوں کو بُلا تو تجھ پر برکت ہوگی کیونکہ اُن کے پاس تجھے بدلہ دینے کو کچھ نہیں اور تجھے راستبازوں کی قیامت میں بدلہ ملیگا (لوقا ۱۴: ۱۲-۱۳)

کلمتہ اللہ نے امیری اور غریبی کی درجہ بندی مٹانے کو ایک تمثیل بھی اور فرمایا۔ "ایک دولتمند تھا جو ارغوانی اور مہین کپڑے پہنتا اور ہر روز خوشی مناتا اور ہر روز شان و شوکت سے رہتا تھا۔ اور لعزر نام ایک غریب ناسوروں سے بھرا ہوا اُس کے دروازے پر ڈالا گیا۔ اُسے آرزو تھی کہ دولتمند کی میز کے جھوٹے سے اپنا پیٹ بھرے۔ بلکہ کتے بھی آکر اُس کے ناسور چاٹتے تھے۔ اور ایسا ہوا کہ وہ غریب مر گیا۔ اور فرشتوں نے اُسے لے جا کر ابرہام کی گود میں رکھ دیا۔ اور دولتمند بھی مُوا اور دفن ہوا۔ اُس نے عالم ارواح کے درمیان عذاب میں مبتلا ہو کر اپنی آنکھیں اُٹھائیں اور ابراہیم کو دُور سے دیکھا اور اُس کی گود میں لعزر کو۔ اور

اُس نے پکار کر کہا اَے باپ ابراہیم مجھ پر رحم کرکے لعزر کو بھیج کہ اپنی اُنگلی کا سرا پانی میں بھگو کر میری زبان تر کرے۔ کیونکہ مَیں اِس آگ میں تڑپتا ہُوں۔ ابراہیم نے کہا بیٹا یاد کر کہ تُو اپنی زندگی میں اچھی چیزیں لے چُکا اور اُسی طرح لعزر بُری چیزیں لیکن اب وہ یہاں تسلّی پاتا ہے۔ تو تڑپتا ہے"۔ (لُوقا ۱۶: ۱۹-۲۵)
کلمۃ اللہ اُن اشخاص کو جو زر سے محبّت رکھتے تھے ہمیشہ ملامت کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ "کوئی شخص دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھیگا اور دُوسرے سے محبّت یا ایک سے ملا رہیگا اور دُوسرے کو ناچیز جانیگا۔ تم خُدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے"۔ (متی ۶: ۲۴) کلمۃ اللہ نے ایک طامع نوجوان کو فرمایا "خبردار اپنے آپ کو ہر طرح کے لالچ سے بچائے رکھو کیونکہ کسی کی زندگی اُس کے مال کی کثرت پر موقُوف نہیں۔ (لوقا ۱۲: ۱۵) ہماری زندگی کی مبارک حالی دولت وسیم وزر پر نہیں۔ بلکہ صرف ہماری روحانی قُوّت اور استعداد پر ہی موقُوف ہے۔ آپ نے ایک تمثیل کے ذریعہ دولت کی بے مائیگی کو لوگوں پر واضح کیا۔ اور فرمایا "کسی دولتمند کی زمین میں بڑی فصل ہُوئی پس وہ اپنے دِل میں سوچ کر کہنے لگا۔ کہ مَیں کیا کروں کہ میرے ہاں جگہ نہیں۔ جہاں اپنی پیداوار بھر رکھوں اُس نے اپنے جی میں کہا مَیں اپنی کوٹھیاں ڈھا کر اُن سے بڑی بناؤنگا۔ اور اُن میں اپنا سارا اناج اور مال بھر رکھونگا اور اپنی جان سے کہونگا۔ اَے جان تیرے پاس بہت برسوں کے لئے بہت سامان جمع ہے۔ چین کر۔ کھا پی خُوش رہ۔ مگر خُدا نے اُس سے کہا اَے نادان اِسی رات تیری جان

تجھ سے طلب کرلی جائیگی۔ پس جو تو نے تیار کیا ہے وہ کس کا ہوگا۔ ایسا ہی وہ شخص ہے جو اپنے لئے خزانہ جمع کرتا ہے۔ اور خدا کے نزدیک دولتمند نہیں۔" (لوقا ۱۲: ۱۶-۲۱) دنیا کی نظر میں وہ اشخاص جن کے پاس دولت ہے اور آسودہ مرفع حال اور ہر دلعزیز ہیں مبارک شمار کئے جاتے ہیں۔ مفلس، غریب اور غمزدہ لوگ بدقسمت سمجھے جاتے ہیں لیکن کلمتہ اللہ نے مفلس، تنگدست اور مصیبت زدہ لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "مبارک ہو تم جو غریب ہو کیونکہ خدا کی بادشاہت تمہاری ہے۔ مبارک ہو تم جو اب بھوکے ہو کیونکہ آسودہ ہوگے۔ مبارک ہو تم جو اب روتے ہو کیونکہ ہنسو گے۔ افسوس تم پر جو دولتمند ہو کیونکہ تم اپنی تسلی پاچکے۔ افسوس تم پر جو اب سیر ہو۔ کیونکہ بھوکے ہوگے۔ افسوس تم پر جو اب ہنستے ہو۔ کیونکہ ماتم کروگے اور روؤگے"۔ (لوقا ۶: ۲۰-۲۵)

ایک دفعہ ایک شخص کلمتہ اللہ کے پاس آیا۔ اور پوچھا کہ "میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوں"۔ آپ کی مردم شناس نگاہ نے تاڑ لیا کہ وہ دولت کا عاشق ہے۔ فرمایا "ایک بات کی تجھ میں کمی ہے۔ جو کچھ تیرا ہے بیچ کر غریبوں کو دے دے۔ تجھے آسمان پر خزانہ ملیگا۔ اور آکر میرے پیچھے ہولے"۔ (مرقس ۱۰: ۲۱) "وہ جوان یہ جواب سن کر غمگین ہوکے چلا گیا۔ کیونکہ بڑا مالدار تھا"۔ (متی ۱۹: ۲۲) اس پر خداوند نے حواریوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "بچو! جو لوگ دولت پر بھروسہ رکھتے ہیں اُن کے لئے خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا کیا ہی مشکل ہے۔ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو"۔ (مرقس ۱۰: ۲۳-۲۵) کلمتہ اللہ کی نگاہ میں طمع گناہ کبیرہ ہے کسی صورت میں بھی

کم نہ تھا۔ چنانچہ آپ کا ایک رسول بھی کہتا ہے کہ "لالچ بت پرستی کے برابر ہے" (کلسیوں ۳: ۵)۔ آپ کی تعلیم کے مطابق دولت قبضے میں رکھنے کی شے نہیں ہے وہ ایک امانت ہے جس پر خدا نے ہم کو مختار کیا ہے (لوقا ۱۲: ۴۲-۴۷، ۱۹: ۱۱-۲۷) لیکن دنیا کے دولتمند اس حقیقت کو ناپسند کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ مالدار کلمۃ اللہ اور آپ کے حواریوں اور پیروؤں کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ (لوقا ۱۶: ۱۴) جب آپ نے دیکھا کہ زردوست آپ کو ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ "جو چیز آدمیوں کی نظر میں عالی قدر ہے وہ خدا کے نزدیک مکروہ ہے"۔ (لوقا ۱۶: ۱۵) دنیا کی نگاہ میں دولت اور حشمت عالی قدر باتیں ہیں لیکن "وہ خدا کے نزدیک مکروہ ہیں"۔

کلمۃ اللہ نے مفلس زدہ لوگوں کا افلاس دور کرنے کی خاطر کوئی لمبا چوڑا لائحہ عمل مرتب نہیں کیا۔ بلکہ محبت کے اصول کو اعلیٰ ترین نصب العین قرار دیکر ہر قسم کے لائحہ عمل کو اس کے ماتحت کر دیا۔ اگر ہم اپنے ابنائے جنس سے محبت کرینگے تو افلاس و غربت کا خود بخود قلع قمع ہو جائیگا مذکورہ بالا واقعہ عبرانیوں کی انجیل میں یوں مرقوم ہے "ایک دولتمند نے خداوند کو کہا۔ اے آقا میں کیا کروں کہ زندگی حاصل کروں۔ اس نے جواب دیا میاں شریعت اور صحائف انبیا پر عمل کر۔ اس نے کہا کہ ان سب پر میں نے عمل کیا ہے۔ خداوند نے جواب دیا جا جو کچھ تیرا ہے بیچ کر غریبوں کو دے۔ اور آ کر میرے پیچھے ہو لے اس پر دولتمند اپنا سر کھجلانے لگا کیونکہ یہ بات اس کو پسند نہ آئی۔ خداوند نے اس کو کہا کہ تو کس طرح کہہ سکتا ہے کہ میں نے شریعت اور صحائف انبیاء پر عمل کیا ہے۔ درحالیکہ شریعت میں لکھا ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ۔ دیکھ تیرے بہت سے بھائی جو آل ابراہیم ہیں چیتھڑوں میں زندگی بسر کر

رہے ہیں۔ اور بھوکوں مر رہے ہیں۔ مگر تیرا گھر مال، اسباب اور سامانِ خورد و نوش سے بھرا پڑا ہے۔ اور اس میں سے کچھ نہیں نکلتا ہے؟"

پس ابن اللہ کی تعلیم کا خصوصی اور امتیازی نشان خدا کی ابوّت و محبّت اور انسانی اخوّت و مساوات ہے۔ یہ اصول ایسے ہیں جو دیگر ادیانِ عالم میں نہیں ملتے۔ بالخصوص قرآن میں بنی نوعِ انسان سے محبت رکھنے کے خلاف جہاد کی تعلیم موجود ہے۔ قرآن کہتا ہے "تم (اے مسلمانو) کفّار کو یہاں تک قتل کرو کہ فتنہ (یا غلبۂ کفر) نہ رہے اور تمام دین خدا کا ہو جائے۔ جنگِ کفّار کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے قوّت اور گھوڑے باندھنے کی تیاری کرو۔ تاکہ ایسا کرنے سے تم اپنے اور خدا کے دشمنوں کو ڈراؤ۔ اے نبی مسلمانوں کو لڑائی پر ابھار"۔ (سورہ انفال ترجمۂ فیض بخش ایجنسی) "اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کر۔ اور اُن پر سختی کر"۔ (سورہ تحریم) "مشرکوں کو جہاں پاؤ۔ قتل کرو اور پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات کی جگہ میں اُن کے لئے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کریں (یعنی مسلمان ہوں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو تم اُن کو جانے دو"۔ (سورہ توبہ) ان آیات نے آیت لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں) کو منسوخ کر دیا۔

ایسی تعلیم کے خلاف کلمۃ اللہ تمام عمر جہاد کرتے رہے۔ آپ نے الٰہی ابوّت کی تعلیم دیکر اخوّتِ انسانی کا سبق تمام دُنیا کو سکھا دیا۔ اِس دُنیا میں جو درجہ بندی اور دیگر اختلافات سے پرے اخوّت و مساوات کو قائم کرنے اور اُنکو ترقی دینے کا سہرہ صرف مسیحی تعلیم کے سر پر ہی رہا ہے۔ چنانچہ مؤرخ لیکی کہتا ہے "مسیحیت نے انسانی فرائض اور انسانی تعلقات میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔ حرّیت اور مساوات کی سرور انگیز صداؤں

نے فضائے عالم میں ایک دلپذیر تبدیلی پیدا کر دی اُس نے انسانی اخوت ومساوات کا ایک نیا تخیل پیش کیا جس نے ذات پات اور درجہ بندی کی تعریف کو مٹا دیا؟"

پس کلمۃ اللہ کی تعلیم دُنیا کے لئے امن وعافیت محبت ورحمت اخوت ومساوات حریت وانصاف کا پیغام بن کر آئی ہے +

(۳)

خیرات:-

انسانی اخوت کا عملی پہلو خیرات اور سخاوت ہے۔ کلمۃ اللہ نے محبت کی تعلیم پر زور دیکر امیر وغریب کے فرق کا ڈنگ نکال دیا۔ اہل یونان کے نزدیک غریب مفلس، بیمار اور مصیبت زدہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ حکیم سقراط نے کبھی کسی سے غربت وافلاس کی نسبت سوال نہ کیا افلاطون کی نظر میں تمام بیمار اور کمزور اور عمر رسیدہ اشخاص قابل نفرت تھے جن کا زندہ رہنا ملک کے حق میں مفید نہ تھا۔ ارسطو اپنی کتاب میں جہاں نیکیوں کی فہرست دیتا ہے وہاں رحم، سخاوت یا خیرات کا ذکر تک نہیں کرتا +

کلمۃ اللہ اس دُنیا میں پہلے معلم تھے جنہوں نے اخوت انسانی کے اس عملی پہلو پر اس قدر زور دیا کہ آپ نے اس کے بغیر خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا غیر ممکن قرار دے دیا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ عدالت کے روز جب سب اقوام عالم کا حساب لیا جائیگا تو خدا کی بادشاہت کا "بادشاہ اپنی دہنی طرف والوں سے کہیگا کہ آؤ میرے باپ کے مبارک

لوگو جو بادشاہت بنائے عالم کے وقت سے تمہارے لئے تیار کی گئی
ہے اُسے میراث میں لو۔ کیونکہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں پیاسا
تھا تم نے مجھے پانی پلایا۔ میں پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں اُتارا۔
ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ بیمار تھا تم نے میری خبر لی۔ قید میں تھا تم
میرے پاس آئے۔ تب راستباز جواب میں اُس سے کہینگے۔ اَے
خداوند ہم نے کب تجھے بھوکا دیکھ کر کھانا کھلایا یا پیاسا دیکھ کر پانی پلایا؟
ہم نے کب تجھے پردیسی دیکھ کر گھر میں اُتارا یا ننگا دیکھ کر کپڑا پہنایا؟ ہم
کب تجھے بیمار یا قید میں دیکھ کر تیرے پاس آئے؟ بادشاہ جواب میں اُن
سے کہیگا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں چونکہ تم نے میرے اِن سب سے چھوٹے
بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یہ کیا۔ اِس لئے میرے ہی ساتھ کیا۔ پھر
وہ بائیں طرف والوں سے کہیگا اَے ملعونو! میرے سامنے سے اُس ہمیشہ
کی آگ میں چلے جاؤ۔ جو ابلیس اور اِس کے فرشتوں کے لئے تیار کی
گئی ہے۔ کیونکہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ پیاسا تھا تم نے
مجھے پانی نہ پلایا۔ پردیسی تھا تم نے مجھے گھر میں نہ اُتارا۔ ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا
نہ پہنایا۔ بیمار اور قید میں تھا تم نے میری خبر نہ لی۔ تب وہ بھی جواب میں کہینگے۔
اَے خداوند! ہم نے کب تجھے بھوکا یا پیاسا یا پردیسی یا ننگا یا بیمار یا قید
میں دیکھ کر تیری خدمت نہ کی؟ اُس وقت وہ اُن سے جواب میں کہیگا میں
تم سے سچ کہتا ہوں چونکہ تم نے اِن سب سے چھوٹوں میں سے کسی
ایک کے ساتھ یہ نہ کیا۔ اِس لئے میرے ساتھ نہ کیا۔ اور یہ ہمیشہ کی سزا
پائینگے۔ مگر راستباز ہمیشہ کی زندگی۔" (متی ۲۵: ۳۴-۴۶)

دُنیائے مذہب میں یہ ایک نیا اصول تھا جو کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ "چونکہ

تم نے میرے اِن سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یہ کیا اس لئے میرے ہی ساتھ کیا"۔ کسی جماعت کی کامیابی کا راز اُس کی مشاہیر پرستی میں مضمر ہے۔ اِن الفاظ سے وہ جوشِ عقیدت ومحبّت عیاں ہے۔ جو شاگرد کلمتہ اللہ کے لئے رکھتے تھے۔ یہ اُس جذبہ کو ظاہر کرتے ہیں جو اُستاد اور شاگرد۔ آقا اور خادم۔ ابن اللہ اور آپکے پیرووں میں تھا فلاسفہ کے فلسفہ میں محرّکات کا فقدان تھا۔ کلمتہ اللہ نے بہترین محرّکات اور مُرغبّات مُہیّا کر دیئے۔ آپ نے فرمایا۔ "تم کو فلاں کام مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن میری خاطر اس کو کرو۔ ایثار نفسی تم کو بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اس کو میری خاطر کروگے تو گرانبار معلوم نہ ہوگی۔ غریبوں کے ساتھ ہمدردی اور محبّت کرنا تم کو آسان معلوم نہیں دیتا۔ لیکن اگر میری خاطر تم مصیبت زدوں اور غریبوں کی امداد کروگے تو تم کو خوشی حاصل ہوگی۔ مؤرّخ لیکی کہتا ہے۔ "درحقیقت مسیحی اخلاق کے چشمہ کا منبع مسیح کی محبت رہی ہے۔ پس جو لوگ ایک مرتبہ مسیح کے عشق ومحبّت میں سرشار ہو جاتے ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں اِنتہائی خلوص و ذوق سے کرتے ہیں جس میں نہ خوف کی آمیزش ہوتی ہے اور نہ صلۂ تحسین کی[۲۰]"۔ یہودی فاضل ڈاکٹر مانٹی فیوری بھی کہتا ہے۔ "یہ ایک نئی ترغیب تھی جس نے دُنیا کی تاریخ پر بے حد اثر کیا ہے یسُوع نے بے اِختیار جذبہ کی ایک ایسی چنگاری جلا دی جس نے اُس کی وفات کے بعد جذبات کو ایسا مشتعل کر دیا۔ کہ اُس کی عینِ حیات میں بھی کبھی ایسا نہ ہُوا تھا۔ الفاظ "یسُوع کی خاطر" نے ہزاروں اشخاص کی زندگیوں کو نیکی کی جانب راغب کر دیا ہے اور ہزاروں شہیدوں کی موت کے وقت یہی الفاظ ان کے حرزِ جان رہے ہیں[۲۱]"۔ درحقیقت یہ الفاظ

صفحۂ گیتی پر خون کے حروف میں لکھے ہوئے موجود ہیں۔ اور آج بھی مسیحی کلیسیا کے افراد لاکھ گئے گذرے، بودے ہوں، پست ہمت ہوں لیکن اپنے آقا و مولا کے نام پر اور اُس ذاتِ قدسی صفات کی خاطر مفلسوں ناداروں، فلاکت زدوں، مصیبت کے ماروں پر اپنی دولت ہی نہیں بلکہ نقدِ جان تک لٹا دینے کے لئے تیار ہیں۔ مورخ لیکی کہتا ہے۔ کہ دُنیا میں سب سے اوّل بار مسیحیت نے یہ بتایا کہ سخاوت انسان کے فرائض اخلاق میں داخل ہے۔ اور تمام معلمین مسیحیت اِس تعلیم کو زور کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ اِس سے بھی زیادہ پُر اثر طریقہ مسیحیت نے یہ اختیار کیا۔ کہ خود مسیح کو فقر و مسکنت کا مجسمہ قرار دے دیا۔ اور اس لئے جو لوگ فقراء اور مساکین کی امداد کرتے تھے وہ گویا خود مسیح کی خدمت کرتے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ سخاوت و فیاضی مسیحیت کا جزوِ غیر منفک بن گئی جس سے مسیحی کسی وقت اور کسی حال میں بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔"[۲۲]

یہودی ربی اپنی صحفِ مقدسہ کے احکام کے بموجب (یسعیاہ ۵۸/۷ وغیرہ) خیرات تو کرتے تھے لیکن وہ خیرات کے صحیح مفہوم سے ناواقف تھے۔ نہ اُن کے انبیاء نے اُن محرکات و مرغبات کی تعلیم دی تھی جو کلمۃ اللہ نے مہیا کئے۔ علاوہ ازیں وہ محض لوگوں کو دکھلانے کی خاطر سخاوت کرتے تھے۔ تاکہ لوگ اُن کی بڑائی کریں۔ اور اُن کی تعریف میں قصیدے پڑھیں لیکن کلمۃ اللہ نے فرمایا "جب تو خیرات کرے اپنے آگے نرسنگا نہ بجوا جیسے کہ ریاکار عبادت خانوں اور کوچوں میں کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ اُن کی بڑائی کریں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے بلکہ جب تو خیرات کرے تو جو تیرا دہنا ہاتھ کرتا ہے اُسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے تاکہ

تیری خیرات پوشیدہ رہے اِس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دیگا" (متّی ۶: ۲-۴) یہی خیرات کا تعلق دلی جذبات کے ساتھ ہے پس لازم ہے کہ ہم ازراہِ رحم و ترس و محبّت، خیرات اور سخاوت کریں نہ کہ خود بینی، خود نمائی اور خود ستائی کی خاطر لوگوں کی مدد کریں خدا ہمارے خیالات اور جذبات کو دیکھتا ہے۔ وہ ہمارے "دلوں اور گردوں کا جانچنے والا" ہے۔ اور ہمارے اصلی اور حقیقی مقاصد و اغراض سے آگاہ ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کتنے آدمیوں کے واسطے سخاوت کی گئی ہے۔ یا کتنی رقم دی گئی ہے مگر اُس کی نگاہ ہمارے دل کے جذبات پر لگی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کلمۃ اللہ ہیکل کے خزانے کے سامنے تشریف رکھتے تھے۔ اور دیکھ رہے تھے کہ "لوگ ہیکل کے خزانہ میں پیسے کس طرح ڈالتے ہیں اور بہتیرے دولتمند بہت کچھ ڈال رہے تھے۔ اتنے میں ایک کنگال بیوہ نے آکر دو دمڑیاں یعنے ایک دھیلا ڈالا۔ خداوند نے اپنے شاگردوں کو پاس بلا کر اُن سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو ہیکل کے خزانے میں ڈال رہے ہیں اِس کنگال بیوہ نے سب سے زیادہ ڈالا" (مرقس ۱۲: ۴۱-۴۴) حالانکہ اِس بیوہ نے صرف ایک پائی دی تھی جو دنیا کی نظر میں کچھ قدر نہیں رکھتی۔ یہودی ربیوں کا حکم تھا کہ کوئی شخص ایسی چھوٹی رقم خیرات نہ کیا کرے۔ لیکن خداوند کی نظر میں وہ بڑی سے بڑی رقم سے بھی زیادہ گرانقدر تھی۔ خدا اِس بات کو نہیں دیکھتا کہ کون سخاوت کرتا ہے یا کیا دیتا ہے۔ یا کتنی رقم دیتا ہے بلکہ خدا اِس بات کو دیکھتا ہے کہ کس جذبہ اور مقصد سے خیرات کی گئی ہے اور کتنی ایثار نفسی سے کام لیا گیا ہے +

(۳۱)

محصُول لینے والے اور گنہگار:-

اہلِ یہُود میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن سے فریسیوں نے ترکِ موالات اختیار کر رکھی تھی۔ اور جن کو وہ بنظرِ حقارت دیکھتے تھے یہ جماعت "محصُول لینے والے گنہگاروں" کی تھی۔ ہیرودیس اور رومیوں کے زمانہ حکومت میں اہلِ یہُود محصُول کے بوجھ کے مارے چیخ پکار کرتے رہتے تھے کیونکہ حکمران محصُول کی چوکیاں ٹھیکے پر دے دیتے تھے۔ اور ٹھیکہ دار جو محصُول چاہتے لوگوں سے وصُول کر لیتے تھے نتیجہ یہ ہُوا کہ تمام محصُول لینے والے نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور اُن کے ہم وطن اُن کے ساتھ کسی قسم کا تعلّق نہیں رکھتے تھے۔

"محصُول لینے والوں" کی جماعت کے علاوہ ایک اور جماعت تھی جس سے فریسی دامن کش رہتے تھے یہ بھی محصُول لینے والوں کی طرح "اچھوت ذات" خیال کی جاتی تھی۔ یہ جماعت "گنہگاروں" کی جماعت کہلاتی تھی اور اس میں وہ تمام لوگ شریک تھے جن کو ان نام نہاد راستباز فریسیوں نے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے اپنی قوم اور برادری سے خارج کر رکھا تھا۔ فریسیوں کا چھاج اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کیا کرتے تھے لیکن جس شے کو وہ بھُوسی سمجھتے تھے وہ کلمۃ اللہ کی نظر میں گرانقدر تھی اور جس کو وہ گیہوں خیال کرتے تھے وہ آپ کی مردم شناس نظر میں بھُوسی سے بھی کم مایہ تھی۔ فریسی اُن اشخاص کو جو علانیہ گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتے تھے اور قوم کے "معزز" رکن خیال کئے جاتے تھے۔ اُن کے گناہوں کی

وجہ سے ملامت تک نہیں کرتے تھے لیکن کلمۃ اللہ نے علانیہ اور خفیہ گناہوں کی تمیز کو مٹا دیا۔ آپ نے اُن پر اس ہماکیہ سے بھی بڑی غلطی کو ظاہر فرمایا۔ اور یہ تعلیم دی کہ دولت کی محبت۔ خودغرضی۔ خودپرستی۔ خودنمائی۔ غرور۔ تمکنت اور عیب جوئی جیسے "معزز" گناہ خدا کی نظر میں بُت پرستی۔ زنا اور قتل وغیرہ کے برابر ہیں۔ بلکہ آپ کے خیال میں مقدم الذکر گناہ "کبیرہ" گناہوں سے بھی زیادہ سنگین تھے کیونکہ اُنکے ارتکاب کرنے والوں کو احساسِ گناہ نہ تھا۔ لہٰذا وہ اُن سے توبہ بھی نہیں کرتے تھے۔ اسی واسطے آپ نے فرمایا کہ محصول لینے والے اور کسبیاں" (جو کبیرہ گناہوں کی مرتکب ہو کر توبہ کرتی ہیں) فریسیوں اور کاہنوں کی جماعت سے (جن کو اپنے گناہوں کا احساس بوجہ ضمیر کی مُردگی کے نہیں رہا) پہلے خدا کی بادشاہت میں داخل ہونگی" (متی ۲۱: ۳۱)

دوڑ زاہد کہ قیامت میں قیامت آئی
داخلِ خلد گنہگار ہوئے جاتے ہیں

فریسی ایک دوسرے کو "معزز" خیال کرتے تھے لیکن "وہ عزت جو خدائے واحد سے ہوتی ہے نہیں چاہتے تھے"۔ (یوحنا ۵: ۴۴)

فریسیوں کا یہ خیال تھا کہ خدا محاسب ہے جو احکام صادر کرنے کے بعد نیک و بد اعمال کے حساب میں مشغول رہتا ہے پس شرعی احکام کی ظاہری تابعداری اور نیکی دونوں مترادف باتیں سمجھی جاتی تھیں۔ لہٰذا جو شخص شریعت کو جانتا اور اُس پر عمل کرتا ہے وہ نیک ہے اور جو شریعت سے ناواقف ہے اور اُس پر عمل نہیں کرتا بدکار ہے"۔ پس فریسیوں نے نیکی اور اخلاق کو صرف ظاہری افعال تک محدود کر رکھا تھا۔ اُنکا خیال تھا کہ چونکہ وہ الٰہی احکام کو نہیں توڑتے لہٰذا وہ راستباز ہیں پس وہ اس راستبازی پر نازاں رہتے اور "ناراستوں" کو بنظر حقارت دیکھتے تھے

کلمتہ اللہ نے ایسی تعلیم کے خلاف اپنے حواریوں کو خبردار کیا اور فرمایا "میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں ہرگز داخل نہ ہوگے"۔ (متی ۵: ۲۰) آپ نے یہ تعلیم دی کہ راستبازی مختلف احکام کی تعمیل کا نام نہیں ہے۔ اور نہ گناہ فلاں فلاں حکم توڑنے کا نام ہے بلکہ انسان کسی خاص حکم کو توڑے بغیر بھی گنہگار ہو سکتا ہے کیونکہ راستبازی ظاہری افعال پر ہی مشتمل نہیں بلکہ انسان کی باطنی حالت پر موقوف ہے آپ نے ایک تمثیل کے ذریعہ اس حقیقت کو واضح کیا۔ اور فرمایا کہ "دو شخص ہیکل میں دعا مانگنے گئے ایک فریسی دوسرا محصول لینے والا۔ فریسی کھڑا ہو کر اپنے جی میں یوں دعا مانگنے لگا۔ کہ اے خدا میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ باقی آدمیوں کی طرح ظالم بے انصاف زناکار یا اس محصول لینے والے کی مانند نہیں ہوں۔ میں ہفتے میں دو بار روزہ رکھتا اور اپنی ساری آمدنی پر دہ یکی دیتا ہوں لیکن محصول لینے والے نے دور کھڑے ہو کر اتنا بھی نہ چاہا کہ آسمان کی طرف آنکھ اٹھائے بلکہ چھاتی پیٹ پیٹ کر کہا کہ اے خدا مجھ گنہگار پر رحم کر۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ شخص دوسرے کی نسبت راستباز ٹھہر کر اپنے گھر گیا"۔ (لوقا ۱۸: ۱۰-۱۴) فریسی اپنے اعمال پر نازاں تھا اور ظاہری افعال کی وجہ سے اپنے آپ کو راستباز خیال کرتا تھا۔ لیکن "اس کا دل اس میں راست نہیں" تھا (حبقوق ۲: ۴) لیکن محصول لینے والا بارگاہ ایزدی سے اپنے گناہوں کی مغفرت حاصل کر کے راستباز ٹھہرا۔ ؎

نصیب ماست بہشت اے خداشناس برو
کہ مستحق کرامت گنہگار انند

بعض یہودی مصنفین لکھتے ہیں کہ فریسی کئی قسم کے تھے:۔

(۱) وہ جو اپنے کندھوں پر اپنے نیک اعمال کی فہرست لٹکا کر باہر جایا کرتے تھے۔

(۲) وہ جو کہتے تھے کہ ہماری نیکیاں ہمارے گناہوں سے شمار میں بہت زیادہ ہیں۔

(۳) وہ جو کہتے تھے کہ کاش ہم جانتے کہ ہم نے کوئی گناہ کیا ہے تاکہ اپنے نیک اعمال سے اُس کے داغ کو مٹا ڈالتے! چنانچہ یہودی عالم فریڈ لینڈر خداوند مسیح کے ہم عصر یہود کی نسبت فتویٰ دیتا ہے کہ "نہ صرف صدوقی بلکہ فریسی بھی کامل طور پر دنیادار بن گئے تھے اور بدترین مادیت اور ریاکاری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ . . اُس صدی کے بدترین کیڑے کا نام "فریسی" تھا۔ وہ دنیا کو تباہ کرنے والے تھے"۔[۲] جس جماعت کے شرکار کی ذہنیت اس درجہ تک گر چکی ہو اس سے کس طرح توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ گنہگاروں کو ترس اور محبت کی نگاہ سے دیکھیگا؟ فریسی اپنے ظاہری افعال کے سبب اپنے آپ کو راستباز اور "محصول لینے والوں اور گنہگاروں" کو ملعون اور جہنم کے وارث خیال کرتے تھے لیکن کلمۃ اللہ اِن گنہگاروں اور محصول لینے والوں کے پاس جاتے اُن کو خدا کی محبت و ابوت کا پیغام سناتے اور اُن کے ساتھ اختلاط اور محبت کا رابطہ قائم کرتے تھے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہُوا کہ "سارے محصول لینے والے اور گنہگار اُس کے پاس آتے تھے تاکہ اُس کی باتیں سنیں"۔ (لوقا ۱۵ باب) فریسی یہ دیکھ کر بڑبڑاتے تھے (لوقا ۵: ۳۰) کلمۃ اللہ کے خلاف اُن کو ہمیشہ یہی شکایت رہی اور وہ آنخداوند کو طعنہ دیکر کہتے تھے یہ شخص "محصول لینے والوں اور گنہگاروں کا یار" ہے (متی ۱۱: ۱۹)۔ لیکن آپ کو اس بات کی پرواہ نہ تھی آپ اس خارج شدہ جماعت کے شرکاء کے ساتھ آزادانہ ملتے۔ اُن کے ساتھ کھاتے پیتے اُن کے

گھروں میں جاتے اور اُن کو اپنے گھر بلاتے تھے (لوقا ۱۹: ۷+مرقس ۲: ۱۴+ متی ۹: ۱۰-۱۳ وغیرہ) چنانچہ ایک دفعہ جب آپ کھانا کھا رہے تھے تو بہت سے محصول لینے والے اور گنہگار آپ کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے" فریسی اور اُن کے فقیہہ اُس کے شاگردوں سے یہ کہہ کر بڑبڑانے لگے کہ تم کیوں محصول لینے والوں اور گنہگاروں کے ساتھ کھاتے پیتے ہو۔ یسوع نے جواب میں اُن سے کہا کہ تندرستوں کو حکیم درکار نہیں۔ بلکہ بیماروں کو۔ میں راستبازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو توبہ کے لئے بلانے آیا ہوں"۔ (لوقا ۵: ۳۰-۳۲)

کلمۃ اللہ نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اس خارج شدہ جماعت میں سے ایک شاگرد (متی) کو منتخب بھی کیا۔ جو ہر وقت آپ کے ساتھ رہتا تھا اس انتخاب سے یہودی ربیوں اور فریسیوں کو ضرور ٹھوکر لگی ہو گی اور ظاہر طور پر آپ کی منادی کو ضرور صدمہ پہنچا ہو گا۔ لیکن آپ نے اس بات کی رتی بھر پروا نہ کی آپ نے فریسیوں کی حماقت آمیز روش کے خلاف احتجاج کیا۔ اور اُن پر یہ صداقت ظاہر فرمائی کہ بارگاہِ الٰہی میں تائب گنہگار کی ایسے شخص سے زیادہ قدر ہے۔ جو اپنے آپ کو راستباز خیال کرتا ہے ؎

گنہگار اندیشہ ناک از خُدا
بہ از پارسائے عبادت نما

چُنانچہ ایک دفعہ ابن اللہ کسی فریسی شمعون کے گھر کھانا کھا رہے تھے۔ "ایک بدچلن عورت جو اُس شہر کی تھی یہ جان کر کہ وہ اُس فریسی کے گھر میں کھانا کھانے بیٹھا ہے سنگ مرمر کی عطردانی میں عطر لائی اور اس کے پاؤں کے پاس روتی ہوئی پیچھے کھڑی ہو کر اس کے پاؤں آنسوؤں سے بھگونے لگی اور اپنے سر کے بالوں سے پونچھے۔ اور اُس کے پاؤں بہت چومے اور اُن پر عطر ڈالا

اُس کی دعوت کرنے والا فریسی یہ دیکھ کر اپنے جی میں کہنے لگا کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو جانتا کہ جو اُسے چھوتی ہے وہ کون اور کیسی عورت ہے کیونکہ بدچلن ہے" بعینہ یہ خیال آنجہانی مرزا صاحب قادیانی نے اپنے رسالہ ضمیمہ انجام آتھم میں صفحہ ۶ پر دُہرایا ہے۔ خُداوند نے جو جواب فریسی کو دیا وہ مرزا صاحب اور اُس کے قادیانی مریدوں کے لئے کافی ہے آپ نے جواب میں فرمایا "کسی ساہوکار کے دو قرضدار تھے ایک پانسو دینار کا دُوسرا پچاس کا۔ جب اُن کے پاس ادا کرنے کو کچھ نہ رہا تو اُس نے دونوں کو بخش دیا پس اُن میں سے کون اُس سے زیادہ محبّت رکھیگا؟ شمعُون نے جواب میں کہا میری دانست میں وہ جسے اُس نے زیادہ بخشا۔ اُس نے اُس سے کہا تُو نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ اور اُس عورت کی طرف پھر کر اُس نے شمعُون سے کہا کیا تُو اِس عورت کو دیکھتا ہے؟ میں تیرے گھر میں آیا تُو نے میرے پاؤں دھونے کو پانی نہ دیا۔ مگر اُس نے میرے پاؤں آنسوؤں سے بھگو دیئے اور اپنے بالوں سے پُونچھے۔ تُو نے مجھ کو بوسہ نہ دیا مگر اُس نے جب سے میں آیا ہُوں میرے پاؤں کو چُومنا نہ چھوڑا۔ تُو نے میرے سر میں تیل نہ ڈالا مگر اُس نے میرے پاؤں پر عطر ڈالا ہے اِسی لئے میں تجھ سے کہتا ہُوں کہ اِس کے گناہ جو بہت تھے معاف ہُوئے کیونکہ اُس نے بہت محبّت کی اور اُس عورت سے کہا تیرے گناہ معاف ہُوئے تیرے ایمان نے تجھے بچا لیا۔ سلامت چلی جا۔" (لُوقا ۷: ۳۷-۵۰) سہ

لنگر حلم تو اے کشتی توفیق کجاست
که دریں بحر کرم غرق گناہ آمده ایم

کلمۃ اللہ نے اہلِ یہود کو فرمایا کہ "ننانوے راستبازوں کی نسبت جو توبہ کی حاجت نہیں رکھتے ایک توبہ کرنے والے گنہگار کی بابت آسمان پر زیادہ

خوشی" ہوتی ہے۔ (لوقا ۱۵: ۷)

ابن اللہ کا یہ معمول تھا کہ ایسے لوگوں سے جو" توبہ کی حاجت" رکھتے تھے ضرور رابطہ محبت پیدا کرتے تا کہ خدا کی ازلی محبت ان پر ظاہر کریں چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ یریحو میں داخل ہو کر جا رہے تھے اور" زکائی نام ایک آدمی تھا جو محصول لینے" والوں کا سردار اور دولتمند تھا۔ وہ یسوع کے دیکھنے کی کوشش کرتا تھا کہ کون سا ہے۔ لیکن بھیڑ کے سبب دیکھ نہ سکتا تھا۔ اس لئے کہ اُس کا قد چھوٹا تھا۔ پس اُسے دیکھنے کے لئے آگے دوڑ کر ایک گولر کے پیڑ پر چڑھ گیا۔ کیونکہ وہ اسی راہ سے جانے کو تھا۔ جب یسوع اس جگہ پہنچا تو اُوپر نگاہ کر کے اُس سے کہا اے زکائی جلد اتر آ کیونکہ آج مجھے تیرے گھر رہنا ضرور ہے وہ جلد اُتر کے اُس کو خوشی سے اپنے گھر لے گیا۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو سب بڑبڑا کر کہنے لگے کہ وہ تو ایک گنہگار شخص کے ہاں جا اُترا اور زکائی نے کھڑے ہو کر خداوند سے کہا۔ اے خداوند دیکھ میں اپنا آدھا مال غریبوں کو دیتا ہوں اور اگر کسی کا کچھ ناحق لے لیا ہے تو اُس کو چوگنا ادا کرتا ہوں۔ یسوع نے اُس سے کہا کہ آج اِس گھر میں نجات آئی ہے۔ کیونکہ ابن آدم کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈھنے اور نجات دینے آیا ہے"۔ (لوقا ۱۹: ۱-۱۰)

ابن اللہ کی خدمت کا نصب العین یہی تھا کہ دُنیا کے گم گشتہ فرزندوں کو پھر آسمانی باپ کے پاس لائیں تا کہ خدا کا محبت بھرا ارادہ جو وہ کل بنی نوع انسان کے لئے رکھتا ہے اُن پر ظاہر کرے (متی ۱۱: ۲۵) خدا نہ صرف راستبازوں کا باپ ہے جو اُس کے احکام بجا لاتے ہیں بلکہ اُس کی محبت گنہگاروں اور بدکرداروں پر بھی حاوی ہے اور وہ سب کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ سب بے منت و بے سوال و بے استحقاق۔ دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی تو ہے

کلمتہ اللہ نے کسی شخص کو اُس کی گذشتہ بُری زندگی کی وجہ سے خُدا کی بادشاہت سے خارج نہ کیا اِس بادشاہت کے دروازے جس طرح فریسیوں صدوقیوں اور راستبازوں کے لئے کھُلے تھے۔ اُسی طرح محصُول لینے والوں۔ گنہگاروں اور کسبیوں کے لئے کھُلے تھے۔ کلمتہ اللہ کے "راستباز" پیرو جنہوں نے فریسی خیالات اور حلقوں میں پرورش پائی تھی اُن "گنہگار" اشخاص کے ساتھ جن سے وہ پہلے دامن کش رہتے تھے نہایت آزادانہ اور بے باک ہو کر ملتے اور اُن سے صحبت رکھتے تھے۔

کلمتہ اللہ کے اقوال و افعال نے یہ ثابت کر دیا کہ خُدا کی لازوال محبّت گنہگاروں کی تلاش میں رہتی ہے (لُوقا ۱۵: ۴ و ۸) اور ہمارے آسمانی باپ کے دل میں کامل محبّت جوش زن رہتی ہے اور وہ گنہگاروں کو پھر اپنے سینہ کے ساتھ لگانے کا منتظر رہتا ہے (لُوقا ۱۵: ۲۰) آپ نے فرمایا کہ خُدا تمام تائب گنہگاروں کو مرحبا کہتا ہے جو اُس کی لازوال محبّت پر نظر کر کے اُسکی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کیونکہ اِسی ایک مقصد کی خاطر خُدا انسانی زندگی میں کام کرتا ہے اور اُس کی محبّت اسی مُبارک انجام کا انتظار کرتی رہتی ہے (لُوقا ۱۵: ۷ و ۲۰ و ۳۲) کلمتہ اللہ کی خوشخبری کی یہ حقیقت بالکل نئی بات تھی چنانچہ یہودی عالم ڈاکٹر مانٹی فیوری کہتا ہے "یقیناً یہ ایک نئی بات ہے جس کی نظیر ہم کو نہ تو عہدِ عتیق کی کُتب میں اور نہ طالمود میں نظر آتی ہے۔ نہ تو انبیائے سابقین اور نہ زمانہ سلف کے یہودی ربّی اِس حقیقت کو پہنچ سکے۔ اِن تصانیف میں توبہ کی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن اِن میں گنہگار کی تلاش کا نام تک موجود نہیں" پھر ایک اور جگہ یہی فاضل مُصنّف کہتا ہے کہ "گنہگار کو تلاش کر کے ڈھونڈھنا اور بدکرداروں سے ترک موالات کرنے کی بجائے میل جول پیدا کرنا اور اُن کی نجات کی خاطر اُن سے محبّت پیار کرنا میرے

خیال میں یہ باتیں ایسی تھیں جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں بالکل نئی تھیں[۲۹]"
گنہگار کلمۃ اللہ کے پاس محض آپ کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہونے کی خاطر نہیں
آتے تھے۔ بلکہ وہ آپ کے پاس آتے تھے کیونکہ آپ اُن کو نہایت خندہ
پیشانی سے قبول کرکے اُن کو خدا کے پاس لاتے تھے۔ فریسی گنہگاروں
کے گناہوں کو تو پیش نظر رکھتے تھے لیکن گنہگاروں کی روحوں کو فراموش کر
دیتے تھے۔ ابن اللہ اُن کے گناہوں کو نظر انداز کرکے اُن کی بیش قیمت
رُوحوں کی پرواکرتے تھے۔ آپ کی خوشخبری محض الٰہی مغفرت کے اعلان
پر ہی مشتمل نہیں تھی بلکہ آپ عملی طور پر اس اعلان کو اُن کے سامنے پیش کرکے
اُن کے بہتر جذبات کو اپیل کرتے۔ اُن کی تلاش کرکے اور اُن کے ساتھ
رفاقت اور میل جول رکھ کر اُن کو توبہ اور الٰہی مغفرت کی طرف راغب کرتے تھے۔
مرزا صاحب قادیانی کے مندرجہ بالا اعتراض کے جواب میں ہم یہودی فاضل
ڈاکٹر مانٹی فیوری کے الفاظ نقل کرتے ہیں تاکہ دورِ حاضرہ کے مومن مسلمان بلکہ
مُلہم نبی اہل یہود سے جن کو قرآن "ناخلف" اور "سیاہ باطن" قرار دیتا ہے ایمانداری
اور صداقت پسندی سیکھیں۔ یہ عالم کہتا ہے "جس طرز سے اور جس سرگرمی سے
یسوع نے نجات کا پیغام ان لوگوں کو (یعنی گنہگاروں اور کسبیوں کو) پہنچایا
وہ اسرائیل میں ایک نئی بات تھی۔ یسوع خود گناہ سے مُبرا تھا لیکن اس وجہ
سے اُس نے گوشہ نشینی اختیار نہ کی اور نہ گنہگاروں سے کنارہ کش رہا۔ ایک طرف
اُس نے محصول لینے والوں اور کسبیوں سے میل جول رکھا اور دوسری طرف
اُس نے کوڑھی، مجنون اور آسیب زدہ لوگوں کو شفا بخشی جو اپنے گناہوں کی
سزا لئے پھرتے تھے اگرچہ وہ ایک نبی تھا تاہم وہ کسبیوں سے دامن کش
نہیں رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُن کے چھونے سے اُس کی پاکیزگی میں کسی

قسم کا فرق نہیں آئیگا۔ کسبیوں کے ہاتھ لگنے سے اُس کے دل میں بُرے خیال پیدا نہیں ہوتے تھے وہ گنہگاروں کو ہمیشہ شفا بخشتا تھا۔ لیکن اُن کے گناہوں سے اُس کو سخت نفرت تھی۔ یہ لوگ اُس کے پاس بھاگے آتے تھے اور اُس کے پاس آکر وہ اپنے گناہوں کی نجاست میں قائم نہیں رہتے تھے بلکہ اُس سے نجات پاتے تھے۔ اُس کے ہمعصر اُس کو از راہِ طعن و تشنیع "گنہگاروں کا یار" کہتے تھے لیکن درحقیقت اس سے زیادہ جلیل القدر خطاب یسوعؑ کے لئے تجویز ہی نہیں کیا گیا"۔

(۴)

فروتنی اور ایثار نفسی:-

ابن اللہ نے فرمایا کہ اِس دُنیا میں جہاں درجہ بندی کی قیود موجود ہیں ہر شخص بڑا ہونا اور بڑا کہلانا چاہتا ہے لیکن آسمان کی بادشاہت میں فروتن، حلیم اور مسکین لوگوں کی زیادہ قدر ہے کلمۃ اللہ کے یہودی شاگرد جو ایک دُنیاوی سلطنت کے خواب دیکھ رہے تھے اِس بات کے منتظر تھے کہ جب آسمان کی بادشاہت اس دُنیا پر قائم ہوگی تو اُنکا رتبہ بڑھیگا اور اُن کی عزت افزائی ہوگی لیکن کلمۃ اللہ نے اُن کو حلیمی اور انکساری کا سبق پڑھایا اور فرمایا کہ "تم جانتے ہو کہ جو اقوامِ عالم کے سردار سمجھے جاتے ہیں وہ اُن پر حکومت چلاتے اور اُنکے امیر اُن پر اختیار جتاتے ہیں لیکن تم میں ایسا نہ ہوگا بلکہ جو تم میں بڑا ہونا چاہیے وہ تمہارا خادم بنے اور جو تم میں اوّل ہونا چاہے وہ سب کا غلام بنے" (مرقس ۱۰: ۴۲-۴۴) آپ کی زبانِ حقائق ترجمان نے یہ اصول قائم کیا کہ "جو تم میں بڑا ہے وہ تمہارا خادم بنے۔ جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائیگا وہ چھوٹا کیا جائیگا اور

جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائیگا وہ بڑا کیا جائیگا۔" (متی ۲۳: ۱۱-۱۲) آپ نے خود اپنی زندہ مثال پیش کر کے فرمایا۔ "مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم اور دل کا فروتن ہوں اور تمہارے درمیان خدمت کرنے والے کی مانند ہوں ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے" (متی ۱۱: ۲۹ + لوقا ۲۲: ۲۷ + مرقس ۱۰: ۴۵)

ع ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

چنانچہ اپنی زندگی کی آخری رات کھانے سے پہلے آپ نے اس عظیم الشان اصول کا عملی نمونہ اپنے شاگردوں کو دیا۔ آپ نے دستر خوان سے اٹھ کر کپڑے اتارے اور رومال لے کر اپنی کمر میں باندھا۔ اس کے بعد برتن میں پانی ڈال کر شاگردوں کے پاؤں دھونے اور جو رومال کمر میں بندھا تھا، اس سے پونچھنے شروع کئے۔ جب وہ ان کے پاؤں دھو چکا اور اپنے کپڑے پہن کر پھر بیٹھ گیا تو ان سے کہا کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا۔ تم مجھے استاد اور خداوند کہتے ہو اور خوب کہتے ہو کیونکہ میں ہوں پس جب مجھ خداوند اور استاد نے تمہارے پاؤں دھوئے تو تم پر بھی فرض ہے کہ ایک دوسرے کے پاؤں دھویا کرو کیونکہ میں نے تم کو ایک نمونہ دکھایا ہے کہ جیسا میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے تم بھی کیا کرو۔" (یوحنا ۱۳: ۴-۱۵)

ابن اللہ نے شاگردوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ جو فروتن ہیں درحقیقت مبارک ہیں (متی ۵: ۵) یہ تعلیم دنیائے اخلاق میں بالکل نئی تھی۔ ارسطو کہتا ہے کہ بہترین انسان وہ ہے جو اپنی نیکی اور راستبازی سے آگاہ ہو کر دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے وہ اپنے سے اعلیٰ آدمیوں کی طرف متکبرانہ انداز سے دیکھتا ہے اور اپنے سے ادنیٰ لوگوں کو بندہ نوازی کی نگاہ سے دیکھتا ہے[۳]۔ لیکن کلمتہ اللہ کی تعلیم اس کے بالکل برعکس ہے۔ جو شخص اپنے پڑوسی سے اپنی

مانند پیار کرتا ہے وہ نہ تو کسی سے تکبّر کے ساتھ پیش آتا ہے اور نہ کسی کی تحقیر کرتا ہے بلکہ وہ دُوسروں کی خوبیوں کی قدر کرتا ہے اور اُن کی تقصیروں کی وجہ سے اُن کی تحقیر نہیں کرتا بلکہ اُن پر ترس کھاتا ہے اور خُود فروتن حلیم اور منکسر المزاج ہو جاتا ہے۔ حقیقی محبّت اِس بات کی متقاضی ہے کہ بڑا چھوٹے کی خِدمت کرے۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم کے مطابق فروتنی درحقیقت خُود فراموشی ہے حلیم شخص دُوسروں کی خِدمت میں اپنا وجُود بھُول جاتا ہے وہ جو حلیم اور دِل کا فروتن تھا" (متی ۱۱: ۲۹) اُس نے اپنے آپ کو خالی کر دیا اور خادم کی صُورت اِختیار کی اور انسانوں کے مُشابہ ہو گیا۔ اور انسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کر دیا اور یہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی" (فلپیوں ۲/۸)

ع۔ خاک شو پیش ازاں کہ خاک شوی

کلمۃ اللہ نے خُود کامل نمُونہ پیش کر کے اپنے شاگردوں کو بھی فرمایا "اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خُودی سے اِنکار کرے اور ہر روز اپنی صلیب اُٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے کیونکہ جو کوئی اپنی جان بچانی چاہے وہ اُسے کھوئیگا اور جو کوئی میرے اور انجیل کے واسطے اپنی جان کھوئے وُہی اُسے بچائیگا۔ جو اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے وہ اُسے کھو دیتا ہے اور جو دُنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے وہ اُسے ہمیشہ کی زندگی کے لیئے محفوظ رکھیگا" (لوقا ۹: ۲۳-۲۵+ مرقس ۸: ۳۴-۳۷+ یُوحنّا ۱۲: ۲۴-۲۶)

یہ الفاظ ایسے نہ تھے جو اپنا اثر کیئے بغیر رہتے۔ گو اہلِ یہُود نفس کُشی اور ایثار نفسی کے نام سے ناآشنا نہ تھے لیکن "دُنیائے اخلاق میں پہلی دفعہ یہ اصُول ایسے واضح الفاظ میں بیان ہُوا ہے یہ ایک ایسی بانگ تھی جو پہلے کبھی ایسے واضح اور موثر طریق سے سنائی نہ گئی تھی۔ ایثار نفسی کے مسیحی تصوّر میں اخلاقی قابلیت

کے رنت نے مظاہرے پائے گئے ہیں۔[۳۲] فاضل ڈاکٹر مانٹی فیوری کہتا ہے کہ الفاظ "اپنی خودی کا انکار کرے" میں ایک نیا تصور موجود ہے یسوع سے پہلے خود انکاری کے اصول سے لوگ بالکل ناواقف نہ تھے لیکن ایثار نفسی کا یہ صاف مفہوم اور اس کا متعلقہ نصب العین میرے خیال میں بالکل نئے تھے اور انہوں نے انسانی خیالات جذبات اور افعال کو بے حد متاثر کیا ہے"[۳۳]

(۵)

عیب جوئی کی ممانعت:۔

انسانی تعلقات میں محبت کی مقراض عیب جوئی ہے پس کلمۃ اللہ نے تعلیم دی کہ "عیب جوئی نہ کرو کہ تمہاری عیب جوئی نہ کی جائے۔ کیونکہ جس طرح تم عیب جوئی کرتے ہو اسی طرح تمہاری بھی عیب جوئی کی جائیگی۔ اور جس پیمانے سے تم ناپتے ہو اسی سے تمہارے واسطے ناپا جائیگا۔ تو کیوں اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر غور نہیں کرتا؟ اور جب تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تو اپنے بھائی سے کیونکر کہہ سکتا ہے کہ لا تیری آنکھ میں سے تنکا نکال دوں؟ اے ریاکار۔ پہلے اپنی آنکھ میں سے تو شہتیر نکال پھر اپنے بھائی کی آنکھ میں سے تنکے کو اچھی طرح دیکھ کر نکال سکیگا" (متی ۷: ۱-۵)

خداوند مسیح کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں نہیں چاہیئے کہ ہم اپنے آپ کو منصف قرار دے کر دنیا جہان کے اقوال اور افعال پر فتوے صادر کیا کریں۔ آپ نے فرمایا "کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنے خدا" (مرقس ۱۰: ۱۸) الانسان ضعیف البیان کمزور ہے پس ہم خواہ مخواہ فتوے قائم کرنے سے پرہیز کریں اور لوگوں پر از راہِ محبت ترس کھائیں تاکہ وہ اپنی زندگی کی اصلاح کر سکیں۔

کلمۃ اللہ کی زندگی کا ایک واقعہ انجیل چہارم میں مرقوم ہے جو اس حکم کی بہترین مثال ہے لکھا ہے کہ ایک دفعہ منجیٔ عالمین صبح سویرے ہیکل میں تعلیم دے رہے تھے اور "فقیہہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اُسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا اے اُستاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے۔ توریت میں موسےٰ نے ہم کو حکم دیا کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں پس تو اس عورت کی بابت کیا کہتا ہے؟ انہوں نے اُسے آزمانے کے لئے یہ کہا تا کہ اُس پر الزام لگانے کا کوئی سبب نکالیں۔ مگر یسوع جھک کر اُنگلی سے زمین پر لکھنے لگا۔ جب وہ اس سے سوال کرتے ہی رہے تو اُس نے سیدھے ہو کر اُن سے کہا کہ جو تم میں بیگناہ ہو وہی پہلے اُس کے پتھر مارے اور پھر جھک کر زمین پر اُنگلی سے لکھنے لگا۔ وہ یہ سُن کر بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک ایک ایک کر کے نکل گئے۔ اور یسوع اکیلا رہ گیا اور عورت وہیں بیچ میں رہ گئی۔ یسوع نے سیدھے کھڑے ہو کر اُس سے کہا۔ اے عورت یہ لوگ کہاں گئے؟ کیا کسی نے تجھ پر حکم نہیں لگایا؟ اُس نے کہا اے خداوند کسی نے نہیں یسوع نے کہا میں تجھ پر الزام نہیں لگاتا۔ جا۔ پھر گناہ نہ کرنا" (یوحنا ۸: ۳-۱۱) فقیہہ اور فریسی اس عورت کی آنکھ کے "تنکے" کو نہایت باریک بینی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے لیکن اپنی "آنکھ کے شہتیر پر غور" نہیں کرتے تھے خداوند کے اعجازی الفاظ نے اُن کے دلوں کو تیر کی مانند چھید اور اُنکو اپنی گھنونی حالت نظر آئی لیکن وہ توبہ کئے بغیر وہاں سے چل دیئے اور یہ عورت اپنے گناہوں کی مغفرت حاصل کر کے کلمۃ اللہ کے حضور سے گئی۔

خداوند مسیح خود جلد بازی اور بدگمانی کے شکار ہو چکے تھے (لوقا ۷: ۳۹) اور جانتے تھے کہ یہ باتیں دل کو کس قدر صدمہ پہنچاتی ہیں لہذا آپ نے یہ تعلیم دی کہ

جلد بازی سے کسی شخص کے خلاف کچھ نہ کہنا چاہیئے۔ ایک دفعہ آپ کے ایک شاگرد نے ایک شخص کو دیکھا جو آپ کے نام سے بدروحوں کو نکال رہا تھا لیکن چونکہ وہ آپ کے حواریوں میں سے نہ تھا۔ یوحنا اُس کی طرف سے بدگمان ہُوا اور شاگردوں نے اُس شخص کو منع کیا۔ خُداوند نے اُن کی جلد بازی کی وجہ سے اُن کو جھڑکا اور فرمایا "اسے منع نہ کرنا کیونکہ ایسا کوئی نہیں جو میرے نام سے معجزہ دکھائے اور مجھے جلد بُرا کہہ سکے۔ اس لئے کہ جو ہمارے خلاف نہیں وہ ہماری طرف ہے"۔ (مرقس ۹: ۳۹-۴۰)

ایک دفعہ کلمۃ اللہ اور آپ کے شاگردوں کو سامریوں نے مخالفت کی وجہ سے اپنے گاؤں میں ٹکنے نہ دیا۔ وہ اہلِ یہود کی طرف سے بدگمان تھے۔ اور اُنکا خیال تھا کہ چونکہ خُداوند اور شاگرد بھی یہودی ہیں لہذا وہ بھی اُنکے جانی دُشمن ہوگئے اس جلد بازی کا جواب یعقوب اور یوحنا نے تُرکی بتُرکی دینا چاہا اور جلد بازی کی وجہ سے عرض کی۔ "اے خُداوند کیا تُو چاہتا ہے کہ ہم حُکم دیں کہ آسمان سے آگ نازل ہوکر اُنہیں بھسم کر دے۔ مگر اُس نے پھر کر اُنہیں جھڑکا اور فرمایا تم نہیں جانتے کہ تم کیسی رُوح کے ہو کیونکہ ابنِ آدم لوگوں کی جانیں برباد کرنے نہیں بلکہ بچانے آیا ہے"۔ (لوقا ۹: ۵۴-۵۶) کلمۃ اللہ کی رُوح، محبت، صُلح اور آشتی کی رُوح ہے اور آپ نے اپنے شاگردوں کو غُصہ، عناد اور بدگمانی کی رُوح کے خلاف خبردار فرمایا کیونکہ یہ محبت کے عین نقیض ہیں۔

(۶)

عفو کی تعلیم:-

موسوی شریعت میں انتقام کے جذبہ کی اجازت تھی چنانچہ حُکم تھا کہ "تُو جان

کے بدلے جان لے چوٹ کے بدلے چوٹ" (خروج ۲۱: ۲۳-۲۵) "جیسا کوئی کسی کا نقصان کرے اُس سے ویسا ہی کیا جائے" (احبار ۲۴: ۲۰) کتب سابقہ کی تعلیم ہی یہ تھی کہ "اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت" (متی ۵: ۴۳ + زبور ۱۱۸: ۷، ۱۱۲: ۸-۹ + ۲۴: ۱۸ وغیرہ) لیکن جب کوئی شخص بدی کا بدلہ بدی سے لیتا ہے تو وہ بدی کو مٹانے کے عوض دنیا میں بُرائی کا اضافہ کرتا ہے بُرائی سے بُرائی کبھی مغلوب نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کلمۃ اللہ نے حکم دیا کہ بدی کو نیکی سے مغلوب کرو۔ آپ نے فرمایا "شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے" (متی ۵: ۳۹) لوگ حیران ہو کر پوچھتے ہیں کیا یہ ہو سکتا ہے؟ لیکن آج ہمارے وطن میں یہ مقبول شدہ اصول ہے اور سیاسی حلقوں میں "ستیہ گرہ" کے نام سے موسوم ہے سورگیہ مہاتما گاندھی کی یہی تعلیم تھی کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دو بلکہ جس شے کو تم بُرا خیال کرتے ہو اس کو نیکی سے مغلوب کرو مثلاً گرو کے باغ امرتسر میں ۱۹۲۲ء میں قومی اکالی سکھ پولیس کی مار پیٹ نہ صرف برداشت کرتے تھے بلکہ "دوسرا گال" بھی پھیر دیتے تھے سکھوں نے باوجود مار پیٹ کے حکومت کا مقابلہ نہ کیا۔ اور جس شے کو وہ بُرا سمجھتے تھے اُس کا جواب بُرائی سے نہ دیا۔ لاہور کے اسلامی روزنامہ اخبار زمیندار نے اس زبردست حقیقت کو ذیل کے الفاظ میں تسلیم کیا ہے "محکوموں کے پاس ضبط و انضباط کے ساتھ ایثار و قربانی کی متحدہ طاقت کا مظاہرہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے آگے بڑی سے بڑی جاہ و جلال اور غرور و نخوت والی حکومت گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور نیاز مندانہ دست بستہ محکوموں کے آگے کھڑی ہو کر اُن کی آرزوں کا پورا کرنا تخت و تاج کی بقا کے لئے

ضروری سمجھنی ہے"۔ (۱۷ نومبر ۱۹۲۹ء) یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ اہلِ اسلام بھی جن کی کتاب قرآن میں موسوی شریعت کا اصول لفظ بلفظ درج ہے اور جو کلمۃ اللہ کی عفو کی تعلیم کو ناقابلِ عمل قرار دیا کرتے تھے اب اس اصول کے صحیح ہونے کا اقبال کر رہے ہیں کہ "شریر کا مقابلہ نہ کرنا"۔ اسی زرّیں اصول کی طفیل ہمارے ملک کو برطانیہ جیسی زبردست طاقت کے پنجہ سے آزادی نصیب ہوئی۔ سورگیہ مہاتما گاندھی نے اور خان عبدالغفار خاں نے ہندوستان کے طول و عرض میں یہ منادی کر دی کہ برطانوی سامراج کا تشدّد کے ہتھیاروں سے مقابلہ نہ کیا جائے بلکہ کلمۃ اللہ کے پہاڑی وعظ کے اِس حربہ کا استعمال کیا جائے کہ "شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ اپنے دشمنوں سے محبّت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو"۔ ہندوستان کے کروڑوں باشندوں نے اِن اصول پر ایسا عمل کیا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی اور انگریزوں کے لئے اس کے سوائے اور کوئی چارہ نہ رہا کہ ہمارے ملک کو آزاد کر دیں اور خود یہاں سے چل دیں +

مذکورہ بالا واقعات ثابت کرتے ہیں کہ خداوند مسیح کے زرّیں اصول نہ صرف افراد کے لئے ہی قابلِ عمل ہیں۔ بلکہ اُن کا اطلاق گروہوں۔ جماعتوں اور ملکوں پر بھی ہو سکتا ہے۔ اِن سے ہم کو پتہ چلتا ہے کہ جب کبھی افراد اور ممالک اِس زریں اصول پر چلے تو اُن کے سماجی۔ معاشرتی۔ ملکی اور سیاسی مسائل کا حل ہو گیا اور کہ یہ اُصول بین الاقوامی تعلقات کو ایک محکم بنیاد پر قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہیں۔ مسیحی مذہب کی تاریخ کا ہر صفحہ اِس اصول کی بہترین مثالوں سے خونیں حرفوں میں لکھا ہے مورّخ لیکی کہتا ہے کہ رُومی قیاصرہ کے زمانہ میں "تعذیب و عقوبت کی وہ وہ صورتیں جن کے ذکر سے

بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کبیر السن مردوں اور ضعیف الجثہ عورتوں پر برابر استعمال کی جاتی تھیں اور مظلوموں کی جانب سے استقلال اور پامردی کے وہ نمونے پیش ہوتے تھے جو آج تک دُنیا کے لئے باعثِ حیرت ہیں"۔[۳۴]

زخم ہا برداشتیم و فتح ہا کردیم لیک
ہرگز از خونِ کسے رنگیں نہ شد دامان ما

یہی مؤرخ ایک اور جگہ کہتا ہے "مسیحی لوہے کی سُرخ انگارہ کرسیوں پر بٹھلائے جاتے اور اُن کے بھُنتے ہُوئے گوشت سے دھواں اُٹھتا تھا۔ ان کا گوشت لوہے کے کانٹوں کی مدد سے اُن کی ہڈیوں سے کھُرچا جاتا تھا۔ ایک ایک عضو دُوسرے سے کاٹ کر الگ کیا جاتا تھا اور اس میں جلتا ہُوا سیسہ پلا دیا جاتا تھا۔ اِن زخموں پر نمک مرچ اور سرکہ ڈالا جاتا تھا۔ یہ عذاب سارے سارے دِن جاری رکھے جاتے تھے اور مرد اور عورتیں بلکہ کمزور و نازک لڑکیاں تک اُنہیں برداشت کرتی تھیں"[۳۵]

کلمۃ اللہ نے عفو کی تعلیم دی اور فرمایا کہ اگر کسی شخص نے تمہارے خلاف قصور کیا ہے تو جس طرح تم خُدا کے قصوروار ہو کر الٰہی مغفرت کے اُمیدوار ہو اسی طرح تم بھی اپنے قصورواروں کو مُعاف کرو آپ نے فرمایا کہ "اگر تم آدمیوں کے قصور مُعاف کروگے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تمہیں معاف کریگا۔ اور اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کروگے تو تمہارا باپ بھی تمہارے قصور معاف نہ کریگا"۔ (متی ۶: ۱۴-۱۵) اسی واسطے آپ نے اپنی مختصر دُعا میں ہم کو سکھلایا کہ ہم خُدا سے عرض کریں کہ اے باپ "جس طرح ہم نے اپنے قصورواروں کو معاف کیا ہے تو بھی ہمارے گناہ ہمیں مُعاف فرما" (متی ۶/۱۲) کلمۃ اللہ مظلوم کو فرماتے ہیں کہ تجھ پر ظالم نے ظلم و ستم ڈھایا ہے لیکن تو

اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دے بلکہ اس کو اپنی اور ظالم دونوں کی روحانی ترقی کا وسیلہ بنا۔ (متی ۱۸ : ۱۵) انتقام کے جذبہ پر غالب آ۔ ظالم کو معاف کر اور اس سے اپنی مانند محبت رکھ تاکہ وہ اور تو دونوں باپ کی محبت میں کامل ہو جاؤ۔ آپ نے فرمایا کہ "جب کبھی تم کھڑے ہوئے دعا مانگتے ہو۔ اگر تم کو کسی سے کچھ شکایت ہو تو اسے معاف کرو۔ تاکہ تمہارا باپ بھی جو آسمان پر ہے تمہارے قصور معاف کرے اور اگر تم معاف نہ کروگے تو تمہارا باپ جو آسمان پر ہے تمہارے قصور بھی معاف نہ کریگا" (مرقس ۱۱ : ۲۵-۲۶)

عفو کی تعلیم کلمۃ اللہ کی خصوصی تعلیم ہے عہدِ عتیق میں صدیوں کے دوران میں یہ آواز گاہے گاہے اس طرح سنائی دیتی ہے جیسے بیابان میں کوئی آواز آئے (خروج ۲۳ : ۴ + امثال ۲۰ : ۲۲ + ۲۵ : ۲۱ + ایوب ۳۱ : ۲۹)۔ کتبِ عہدِ عتیق میں خدا کی معافی کی تعلیم ہم کو ضرور ملتی ہے خدا تو معاف کرتا ہے لیکن معافی یافتگان کے لئے اپنے قصورواروں اور دشمنوں کو معاف کرنا لازمی نہ تھا۔ وہ خدا سے معافی حاصل کرکے بھی اپنے دلوں میں اپنے دشمنوں کے خلاف کینہ اور غضب کے جذبات رکھ سکتے تھے ۳۵ (زبور ۱۳۷ : ۶-۹ + ۵۴ : ۴-۷) مابعد کے زمانہ میں یہودی ربی کہتے تھے کہ اگر کوئی شخص کسی کا قصور کرے تو تین دفعہ اس کو معاف کیا جائے۔ خداوند نے فرمایا کہ "اگر تیرا بھائی گناہ کرے اسے ملامت کر۔ اگر توبہ کرے اسے معاف کر اور اگر وہ ایک دن میں سات دفعہ تیرا گناہ کرے اور ساتوں دفعہ تیرے پاس پھر آکر کہے کہ توبہ کرتا ہوں تو اسے معاف کر" (لوقا ۱۷ : ۳-۴) خداوند کا مطلب یہ تھا کہ تو اپنے قصوروار بھائی کو جب وہ توبہ کرے ہمیشہ معاف کر لیکن بعض شاگردوں نے خیال کیا کہ یہودی ربیوں کی طرح آپ نے بھی

ایک حد مقرر کر دی ہے۔ پطرس آپ کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا مَیں اپنے بھائی کو ایک دن میں سات مرتبہ مُعاف کروں خُداوند نے جواب میں فرمایا مَیں تم سے یہ نہیں کہتا کہ سات دفعہ بلکہ سات دفعہ کے سترّ گُنے تک" (متی ۱۸: ۲۱-۲۲) آپ کا مطلب یہ تھا کہ خُدا باپ ہم کو ہر دفعہ جب ہم اُس کے حضور تَوبہ کرتے ہیں معاف فرماتا ہے۔

ع خونِ دو ہزار توبہ بر گردنِ ماست

لیکن پھر بھی خُدا ہم کو ہمیشہ مُعاف کرتا ہے۔ اِسی طرح ہمارے عفو کی بھی کوئی حد نہیں ہونی چاہیئے۔

اِس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کلمۃ اللہ نے ایک تمثیل سُنائی اور فرمایا۔ "آسمان کی بادشاہت اُس بادشاہ کی مانند ہے جس نے اپنے نوکروں سے حساب لینا چاہا اور جب حساب لینے لگا تو اُس کے سامنے ایک قرضدار حاضر کیا گیا جسے دس ہزار توڑے دینے تھے مگر چونکہ اُس کے پاس کچھ ادا کرنے کو نہ تھا۔ اِس لئے اُس کے مالک نے حکم دیا کہ یہ اور اُس کی جورو اور بچے اور جو کچھ اُس کا ہے سب بیچا جائے اور قرض وصول کر لیا جائے پس نوکر نے گِر کر اُسے سجدہ کیا۔ اور کہا اَے خُداوند مجھے مہلت دے تو مَیں تیرا سارا قرض ادا کر دُونگا۔ اُس نوکر کے مالک نے ترس کھا کر اُسے چھوڑ دیا اور اُس کا قرض بخش دیا۔ جب وہ نوکر باہر نکلا تو اُس کے ہمخدمتوں میں سے ایک اُس کو ملا جس پر اُس کے سو دینار آتے تھے۔ اُس نے اُس کو پکڑ کر اُس کا گلا گھونٹا اور کہا کہ جو میرا آتا ہے ادا کر دے۔ پس اُس کے ہم خدمت نے اُس کے سامنے گِر کر اُس کی منت کی اور کہا مجھے مُہلت دے مَیں تجھے ادا کر دُونگا۔ اُس نے نہ مانا بلکہ جا کر اُسے قید خانے میں ڈال دیا کہ جب تک قرض ادا نہ کر دے

قید رہے۔ پس اُس کے ہمخدمت یہ حال دیکھ کر بہت غمگین ہوئے اور آکر اپنے مالک کو سارا احوال سُنا دیا۔ اِس پر اُس کے مالک نے اُس کو پاس بُلا کر اُس سے کہا اے شریر نوکر مَیں نے وہ سارا قرض تجھے اِس لئے بخش دِیا کہ تُو نے میری منّت کی تھی۔ کیا تجھے لازم نہ تھا کہ جیسا مَیں نے تجھ پر رحم کیا۔ تُو بھی اپنے ہم خدمت پر رحم کرتا اور اُس کے مالک نے غصّے ہو کر اُس کو جلّادوں کے حوالے کیا کہ جب تک تمام قرض ادا نہ کرے قید رہے"۔ (متّی ۱۸: ۲۳-۳۴) یہ تمثیل سُنا کر کلمتہ اللہ نے فرمایا۔ "اسی طرح تمہارے ساتھ میرا آسمانی باپ بھی کریگا۔ اگر تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کو دِل سے مُعاف نہ کرے" (متّی ۱۸: ۳۵) کیونکہ خُدا ہم کو تب مُعاف کریگا۔ جب ہمارا دِل توبہ کے ذریعہ نرم اور محبّت سے پُر ہوگا۔ لیکن جو شخص اپنے بھائی کو معاف نہیں کرتا اُس کا دِل سخت اور انتقام کے خیال سے بھرا ہوتا ہے۔ وہ ایسا دِل رکھتے ہُوئے اِلٰہی مغفرت کی کس طرح قدر کر سکتا ہے۔ عفو محبّت کا نتیجہ ہے اور اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو مُعاف نہیں کرتا تو وہ محبّت سے بیگانہ ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اُس اِلٰہی رفاقت سے دُور رکھتا ہے جو گُناہوں کی مغفرت سے ہم کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ "اگر ہم ایک دُوسرے سے محبّت رکھتے ہیں۔ تو خُدا ہم میں رہتا ہے"۔ (۱-یُوحنّا ۴: ۱۲) اور "جو کوئی محبّت رکھتا ہے وہ خُدا سے پیدا ہُوا ہے"۔ (۱-یُوحنّا ۴: ۸) پس اگر ہم اس اِلٰہی خاندان میں قائم رہنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ اپنے بھائیوں کو معاف کر کے اُن سے اُخوّت کا رشتہ قائم رکھیں (۱-یُوحنّا ۴: ۲۰)

مذکورہ بالا تمثیل میں دونوں قرضداروں کے قرضوں کی مقدار قابلِ غور ہے نوکر نے بادشاہ کے ساڑھے تین کروڑ سے زیادہ روپیہ دینے تھے۔ لیکن اُس کے اپنے ہم خدمت نے پچاس سے بھی کم روپیہ دینے تھے۔ پس کلمتہ اللہ کا مطلب

یہ ہے کہ خدا ہمارے کروڑوں قصور مُعاف کرتا ہے۔ پس ہم کو لازم ہے کہ ہم بھی اپنے بھائیوں کے تھوڑے سے قصور مُعاف کیا کریں "خُداوند رحیم اور کریم ہے قہر کرنے میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے وہ ہمارے گُناہوں کے موافق ہم سے سلوک نہیں کرتا اور ہماری بدکاریوں کے مطابق ہم کو بدلہ نہیں دیتا۔" "اگر وہ ہماری بدکاری کو حساب میں لائے تو کون اُس کے حضور قائم رہ سکتا ہے پر جیسے پُورب پچھم سے دُور ہے ویسے ہی اُس نے ہماری خطائیں ہم سے دُور کر دیں۔ جیسے باپ بیٹوں پر ترس کھاتا ہے ویسے خُداوند ہم پر ترس کھاتا ہے"۔ (زبور ۱۰۳ و ۱۳۰)

مری بندگی سے میرے جُرم افزوں

تیرے قہر سے تیری رحمت زیادہ

پس ہم پر بھی لازم ہے کہ ہم جو الٰہی مغفرت کے اُمیدوار ہیں۔ اپنے قصورواروں کو تہِ دِل سے مُعاف کیا کریں +

جس طرح کلمتہ اللہ نے عفو کی نئی تعلیم دی اُسی طرح آپ نے اس تعلیم پر کاربند ہو کر ایک نیا نمونہ بنی نوع انسان کے سامنے رکھا۔ چنانچہ جب آپ کے دشمن جو آپ کے خُون کے پیاسے تھے آپ کے جسمِ اطہر میں کیلیں ٹھونک رہے تھے تو اس جانکنی کے وقت آپ نے اپنی مبارک زبان سے اُن کے لئے دُعائے خیر فرمائی اور کہا۔ "اے باپ ان کو مُعاف کر کیونکہ یہ جانتے نہیں کہ کیا کرتے ہیں"۔ (لُوقا ۲۳: ۳۴)

افلاطون اور ارسطو کے فلسفۂ اخلاق میں اور ہندوؤں کے فلسفۂ کرم میں توبہ اور مُعافی کو کوئی جگہ نہیں دی گئی لیکن آج دُنیائے اخلاق نے کلمتہ اللہ کے عفو کے اصُول کو قبول کر لیا ہے۔ تمام انسان ایسے شخص کو مرحبا کہتے ہیں

جو خلوصِ قلب سے اپنے دشمن کو معاف کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہمارے پاس آئے اور نہ دل سے اپنی تقصیروں کی معافی کا طلب گار ہو تو ہم اُس کو ضرور معاف کرتے ہیں۔ اور اگر معاف نہیں کرتے تو دنیا ہم کو بُرا کہتی اور بُرا جانتی ہے۔ یہ ایک عامیانہ خیال ہے کہ جو شخص ہم سے بدترین سلوک روا رکھ سکتا ہے وہ خلوص قلب سے توبہ کر ہی نہیں سکتا۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ جتنا بُرا سلوک ہمارے ساتھ کیا جاتا ہے معاف کرنا بھی نسبتاً مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن کلمۃ اللہ کی تعلیم کی روشنی میں معاف کرنا ہمارے لئے نہ صرف ایک احسن امر ہو گیا ہے بلکہ ہمارے فرائض میں شامل ہو گیا ہے۔ اِس تعلیم کا خمیر اِس قدر تاثیر کر گیا ہے۔ کہ جو شخص اِس فرض کو پورا نہیں کرتا وہ دنیا کی نظر میں بھی بُرا شمار ہونے لگ جاتا ہے کیونکہ اب اِنتقام ایک وحشیانہ جذبہ شمار کیا جاتا ہے۔ پس کلمۃ اللہ کی تعلیم نے دنیائے اخلاق کی کایا پلٹ دی ہے۔



باب سوم

تعلیمِ مسیح دربارۂ سلطنتِ الٰہی

(۱)

اہلِ یہود اور خدا کی بادشاہت:-

یہود کا حضرت موسےٰ کے زمانہ سے کوئی دنیاوی بادشاہ نہیں تھا۔ اُن کا یہ ایمان تھا کہ خدا خود اُن کا بادشاہ ہے۔ (۱-سموئیل ۱۲: ۱۶-۱۹) اور کہ قوم یہود خدا کی برگزیدہ قوم ہے۔ (خروج ۲۴: ۷ + ۱-سموئیل ۱۲: ۲۲ وغیرہ) اُن کے بادشاہ یہوواہ نے کوہِ سینا پہ اُن کے لیے قوانین وضع کیئے (خروج ۲۴ باب وغیرہ) خدا خود اپنی قوم کا سپہ سالار اور سرِ لشکر تھا جو اُن کی جنگوں میں اُن کا پیشوا تھا۔ اہلِ یہود کی تاریخ میں دنیاوی لیڈر تھے لیکن وہ یہوواہ سلطان کے ماتحت تھے۔ بنی اسرائیل میں سے ساؤل پہلا شخص تھا جو بادشاہ چُنا گیا (۱-سموئیل ۸ باب) لیکن اُس نے یا اُس کے

جانشین داؤد اور اُس کی اولاد نے کبھی "ربّ خداوند بادشاہ" کی جگہ غصب نہ کی وہ حقیقی سلطان یہوواہ کے ماتحت اُس کی برگزیدہ قوم کے ہادی تھے۔ جو اُس کے واسطے بطورِ نائب کے امورِ سلطنت کو سرانجام دیتے تھے۔ (۲-سموئیل ۷ باب) جب کبھی سلاطین یہود نے اِس حقیقت کو فراموش کیا تو انبیاء اللہ نے جو وقتاً فوقتاً مبعوث ہوئے اس حقیقت کو اُنہیں اور قوم اسرائیل کو بھولنے نہ دیا۔ (۲-سموئیل ۱۲: ۱- ۱۲+ ۱- سلاطین باب ۱۳ + باب ۱۸ وغیرہ)۔ خداوند یہوواہ سرزمین اسرائیل کا بادشاہ تھا۔ جس کا پایۂ تخت یروشلیم تھا جہاں کی ہیکل اُس کا مقدس تھی۔

جب سلطنت یہود کو زوال آیا اور بُت پرست اور مشرک بادشاہوں نے اُس کو فتح کر کے یروشلیم کی ہیکل کو شہید و مسمار کر دیا اور فاتحین یہودی اُمرا اور بادشاہ کو اسیری میں لے گئے تو قوم یہود کو اس بات کا احساس ہوا کہ اُنہوں نے اپنے حقیقی سلطان یہوواہ سے بغاوت کی سزا پائی ہے اُن کا ملک مفتوح ہوگیا۔ اُن کا مایۂ ناز شہر یروشلیم (زبور ۱۲۲) برباد ہوگیا۔ وہ خود جلاوطن ہو گئے۔ جس ہیکل میں خدا سکونت گزیں تھا اور جس کے خلاف ایک لفظ بولنا بھی کفر میں شامل تھا وہ نذرِ آتش ہوگئی۔ اسیری کے جانکاہ سانحے نے اُن کی آنکھیں کھولیں اور اُن پر یہ ظاہر ہوا کہ اُن کا خدا صرف یروشلیم اور یہودیہ میں ہی نہیں رہتا بلکہ وہ زمان و مکان کی قیود کا پابند نہیں اور نہ کوئی خاص قوم یا کہانت یا ظاہری رسوم قربانی وغیرہ اُس کی مقبول نظر ہیں۔ اور یہ بھی اُن پر ظاہر ہوا کہ اگر قوم اسرائیل کسی خاص معنوں میں اس کی برگزیدہ قوم ہے تو صرف اِس لئے ہے کہ وہ دیگر اقوام میں خدا کے علم کی اشاعت کرے۔ (عموس ۴: ۱۳ + ۵: ۸ + میکاہ ۴: ۱- ۳ + یسعیاہ باب ۴۰ و ۴۲ و ۶۰ وغیرہ)

تاکہ اقوامِ عالم بھی خُدا کے نُور سے مستفیض ہو سکیں ۔ اس زمانہ کے انبیاء اور زبُور نویس اِس صداقت کو بار بار اہلِ یہود کے ذہن نشین کرتے تھے۔

" مَیں خُدا نے تجھے (اے اِسرائیل) صداقت کے لئے بُلایا ہے ۔ مَیں لوگوں کے عہد اور قوموں کے نُور کے لئے تجھے دُونگا۔" "مَیں نے (اے اِسرائیل) تجھ کو اقوامِ عالم کے لئے نُور بخشا تاکہ تجھ سے میری نجات زمین کے کناروں تک بھی پہنچے"۔ (یسعیاہ ۴۹: ۶) "مَیں اقوامِ عالم کو بھی اپنی عبادتگاہ میں شادمان کرونگا۔ کیونکہ میرا گھر ساری قوموں کی عبادتگاہ کہلائیگا (یسعیاہ ۵۶: ۶) نیز دیکھو حبقوق ۲: ۱۴ + زبُور ۲۲: ۲۷ - ۳۱ + ۶۵: ۲ - ۵ + ۸۶: ۹ + ۸۷: ۴ - ۷ + ملاکی ۱: ۱۱ + یرمیاہ ۳۱: ۳۴ وغیرہ)

اِن خیالات کے ساتھ ساتھ بعض ہادیانِ مذہب یہ تعلیم بھی دیتے تھے کہ موجُودہ اسیری ایک سزا ہے جو اُن کو اور اُن کے بادشاہ کو خُدا کی طرف سے الٰہی شریعت اور احکام کو فراموش کر دینے کی وجہ سے مِلی ہے ۔ لیکن ایک دِن آئیگا جب وہ سزا بُھگتنے کے بعد پھر اپنے وطن کو واپس جائینگے ۔ اور خُدا اُن کو بحال کریگا اور اُن کی سلطنت از سرِ نَو قائم ہو جائیگی ۔ اور وہ اپنے تمام دُشمنوں پر فتحیاب ہونگے ۔ اور خُدا اُن کو اقوامِ عالم میں ایسی عزّت عطا فرمائیگا کہ اُن کی پہلی سلطنت کی رونق اور شان و شوکت ماند پڑ جائیگی۔ (صفنیاہ کی کتاب عموس ۹: ۱۱ وغیرہ) خُدا از سرِ نَو داؤد کی نسل میں سے ایک بادشاہ اُن پر مقرّر کریگا ۔ (میکاہ ۴: ۳) جو خُدا کے نام میں اور اُس کی قوّت کے باعث راستبازی سے سلطنت کریگا ۔ (یسعیاہ ۹: ۶ - ۷ وغیرہ) داؤد کی سلطنت تو مصر کی سرحد سے دریائے فرات تک تھی ۔ لیکن خُدا کا یہ مسیحِ موعود "قوموں کا وارث ہوگا ۔ اور زمین سراسر اِس کے قبضے میں

ہوگی اور وہ "کمہار کے برتن کی مانند" لوہے کے عصا سے" اقوام عالم کو کچلیگا (زبور ۲: ۸-۱۰ + دانی ایل ۲: ۴۴) اُس کی سلطنت" ابدی بادشاہت" اور اُس کی حکومت" پشت در پشت قائم رہیگی (زبور ۱۴۵: ۱۳)

اہل یہود مسیح موعود کے اِس تصور کو اپنی قومی تاریخ میں اسیری کے بعد کبھی نہ بھولے۔ یونانی اور رومی فاتحین کے زمانہ میں بار بار یہی تصور اُن کے پیش نظر رہا۔ مکابیوں کا یہوداہ اور دیگر غیرت مند یہودی، فاتحین کے خلاف لشکر کشی کرتے رہے اُن کو شکست پر شکست ملی۔ رومی زمانہ میں اِن کی بغاوتوں کو بڑی سختی اور عقوبت کے ساتھ فرو کیا گیا لیکن یہ تصور اُن کے اذہان میں برابر قائم رہا۔ اور منجی عالمین کے ہم عصر یہود اسی دنیاوی مسیح موعود کے منتظر تھے۔ جو اُن کو رومی فاتحین کے پنجہ سے چھڑائیگا۔ اور مخلصی دلوا کر ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر کے اُن پیشین گوئیوں کو پورا کریگا۔ جو کتب عہد عتیق میں مندرج تھیں۔ اِن تصورات نے ہزاروں کے دل و دماغ پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ وہ آسمان کی طرف نظر اُٹھائے رہتے تھے۔ اور اُن کے نالہ و زاری کی فریاد ہر وقت جواب کی منتظر رہتی اور کہتی "اے نگہبان۔ رات کی کیا خبر ہے"۔ (مرقس ۱۵: ۴۳ + لوقا ۱۴: ۱۵ + ۱۷: ۲۰ وغیرہ) اِن میں ایک بڑی تعداد منظم تھی جو زیلوتیس (Zealots) کے نام سے موسوم تھی۔ لیکن اِن کے علاوہ ہزاروں سرفروش ایسے تھے جو اُس گھڑی کے منتظر تھے جب مسیح موعود اُن کو تلوار چلانے کے لئے بلائیگا۔ اُنکے سر میں ایک ہی خیال سمایا تھا کہ وہ مسیح موعود کے ماتحت ہزاروں دشمنان دین کو موت کے گھاٹ اُتار دینگے اور خدا کی بادشاہت کو قائم کرینگے انبیاء اللہ کے تمام پیغامات جو قوم کے نصب العین کے متعلق تھے بالائے طاق

رکھ دیئے گئے قوم کے دشمنوں کے خلاف جنگ کرنا مذہبی فرائض کی ادائیگی خیال کیا گیا دنیاوی سلطنت اور ثروت کے خواب اور قومی برگزیدگی کے خیالات نے اسیری کے سبق اور خداوندی ارشاد کو کہ "مَیں نے تجھے اقوامِ عالم کے لئے نور بخشا تاکہ تیرے ذریعہ میری نجات زمین کے کناروں تک پہنچے" لوگوں کے دلوں سے محو کر دیا۔ اور حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا +

(۳)

یوحنّا بپتسمہ دینے والا اور خدا کی بادشاہت کی آمد

خداوند یسوع مسیح کے پیش رو یوحنّا نے اس روحانی "بیابان" میں ایک مرتبہ پھر خدا کی اور اس خداوندی ارشاد کو دوبارہ اہلِ یہود پر جتلایا جس کو وہ فراموش کر چکے تھے۔ آپ نے فرمایا توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ (متی ۳ : ۲) جب خداوند کا یہ نذیر ظاہر ہوا تو لوگ جوق در جوق اُس کے پاس آنے لگے۔ اُس کا "آسمان کی بادشاہت" کا تصوّر اہلِ یہود کے خیال کے مطابق نہیں تھا چنانچہ اُس نے اُن کے برگزیدہ قوم ہونے کی خام خیالی کو رفع کیا۔ اور بتایا کہ آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا کسی خاص شخص کی نسل ہونے پر موقوف نہیں۔ بلکہ توبہ اور راستبازی پر منحصر ہے۔ وہ ایک اخلاقی بادشاہت ہے جس کے شرکا کے لئے آلِ ابراہیم میں سے ہونا ضروری نہیں آپ نے اہلِ یہود کو کہا "اپنے دلوں میں یہ خیال نہ کرو کہ ابراہیم ہمارا باپ ہے۔ اب درختوں کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہے۔ پس جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے (متی ۳ : ۹-۱۰) آپ نے مسیح موعود کی خوشخبری دی اور کہا "میرے بعد وہ شخص آرہا ہے جو مجھ سے زور آور ہے میں

اُس کی جُوتیاں اُٹھانے کے لائق نہیں"۔ (متی ۹ : ۱۱)

اِس نذیر کے بعد جب دُنیا کے بشیر نے اہلِ یہود میں خدمت کرنی شروع کی تو آپ نے اُن کو "خُدا کی بادشاہت" کی بشارت دی اور فرمایا کہ "وقت پُورا ہو گیا ہے۔ اور خُدا کی بادشاہت نزدیک آ گئی ہے۔ توبہ کرو اور انجیل کو قبول کرو"۔ (لُوقا ۱ : ۱۵)

بظاہر کلمۃ اللہ نے وُہی الفاظ دُہرائے جو آپکے پیشرو یُوحنّا کی زبان سے نکلے تھے۔ کہ "خُدا کی بادشاہت نزدیک آ گئی ہے"۔ (متی ۳ : ۲ + لُوقا ۱ : ۱۵) لیکن دونوں کے مفہوم میں فرق تھا۔ یُوحنّا اپنے آخری ایّام تک وہ امر نہ سمجھ سکا جس کی بنا پر اُس نے اپنے جانشین کے لئے کی تھی اُس نے قید خانے سے قاصد بھیجے تاکہ معلُوم کرے کہ آیا مسیح موعُود آ گیا ہے اور "خُدا کی بادشاہت" درحقیقت آ گئی ہے اُس کا خیال تھا کہ مسیح موعُود عدالت کے لئے آئیگا۔ اور وہ درختوں کی جڑ پر کلہاڑا رکھیگا تاکہ "جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا اُسکو وہ کاٹ کر آگ میں جھونک دے (متی ۳ : ۱۰) "اُسکا چھاج اُس کے ہاتھ میں ہوگا اور وُہ کھلیان کو خُوب صاف کر کے" بھُوسی کو آگ میں جلائیگا جو بُجھنے کی نہیں"۔ (لُوقا ۳ : ۱۷) اُس کا خیال تھا کہ جب مسیح موعُود آئیگا تو آگ اُس کے آگے آگے ہو گی اور خُدا کا غضب اُس کے پیچھے پیچھے ہوگا اور وہ غیر اقوام رُومی سرداروں۔ یہُودی ریاکاروں اور ہیرودیس جیسے بدکاروں کو ہلاک کر کے خُدا کی بادشاہت قائم کریگا۔ جب خُدا کا مسیح آیا تو وہ خُدا کے غضب کی بجائے خُدا کی لازوال محبّت اور ابدی شفقت اور الہٰی مغفرت کا پیغام لے کر آیا۔ خُداوند مسیح نے یُوحنّا کے قاصدوں کو جواب دیا کہ خُدا کی بادشاہت کے نشان اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر لو (لُوقا ۷ : ۲۱-۲۲) لیکن یہ نشان یُوحنّا

کے خیال کے مطابق نہ تھے ورنہ وہ اپنے شاگردوں کو قاصد بنا کر خداوند کی خدمت میں نہ بھیجتا گو اُس کے خیالات یہودی ربیوں کے سے نہ تھے۔ تاہم وہ یہودیت کی زنجیروں سے آزاد نہ تھے (متی ۹: ۱۴-۱۷) اُس نے "خداوند کی راہ تیار" کی تھی (مرقس ۱: ۳) وہ "دولہا کا دوست" تھا۔ (یوحنا ۳: ۲۹) وہ "چمکتا ہوا چراغ" تھا (یوحنا ۵: ۳۵) اُس نے خدا کی بادشاہت کی آمد کی بشارت دی تھی۔ لیکن خداوند بشیر تھے وہ نذیر تھا وہ خود اس بادشاہت کی دہلیز پر ہی رہا۔ خداوند نے خود فرمایا ہے کہ "جو آسمان کی بادشاہت میں چھوٹا ہے وہ یوحنا سے بڑا ہے"۔ (متی ۱۱: ۱۱) کیونکہ خدا کی بادشاہت کی نسبت اُس کا علم یوحنا کے علم سے بلند وارفع ہے +

(۳)

خداوند یسوع مسیح اور خدا کی بادشاہت۔

کلمتہ اللہ نے اہلِ یہود پر ظاہر کر دیا کہ خدا کی بادشاہت دنیاوی فتوحات کا نتیجہ نہیں۔ وہ فنونِ قاہرہ کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتی اور نہ وہ ممالک محروسہ پر مشتمل ہے۔ بلکہ اُس بادشاہت کی کوئی حدود نہیں ہیں کیونکہ وہ ایک خالص روحانی سلطنت ہے جس کے قوانین عالمگیر ہیں اور جس میں ہر قوم طبقہ اور ملت کے افراد شامل ہو سکتے ہیں۔ ع

که دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

یہ بادشاہت جور و ظلم۔ تعدی اور استبداد۔ عقوبت و تعذیب اور جدال و قتال کی بنیاد پر قائم نہیں بلکہ محبت اور ہمدردی۔ رحم اور خدا ترسی۔ حق اور عدل۔ فروتنی اور انکساری۔ خدمت اور صلیب برداری پر قائم ہے (یوحنا ۱۸: ۳۶ + متی ۱۱: ۲۹ + ۱۸: ۳ + ۲۰: ۲۵-۲۸ وغیرہ) اس بادشاہت میں "جو بڑا ہونا چاہے"۔ وہ

سب کا "خادم" بنے اور جو اوّل ہونا چاہے وہ سب کا غلام بنے"۔ (مرقس ۱۰: ۴۴)

پس خداوند مسیح نے حکومتِ الٰہی کا ایک نیا اصول اس دنیا پر ظاہر کیا جیسا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس اصول کی جھلک انبیاء اللہ کو ملی تھی جس کو انہوں نے اسیری کے زمانہ میں اپنے لوگوں پر ظاہر کیا اور جس کو اہلِ یہود مسیحؑ عالمین کے دنوں میں فراموش کر چکے تھے خداوند نے اس اصول کو اپنی تعلیم کا بنیادی پتھر قرار دے دیا اور دنیا کی تاریخ میں مسیحیت نے پہلی دفعہ اس کو کامل طور پر ظاہر کر کے تمام عالم کی کایا پلٹ دی۔ آپ نے مسیح موعود اور آسمانی بادشاہت کے تصوّرات میں ایک نیا مفہوم ڈال دیا جو پہلے ان میں موجود نہ تھا۔ گلیل کے یہود اور آپ کے ہمعصروں کا یہ خیال تھا کہ جبر و تشدّد کے ذریعہ مسیح اقوامِ عالم پر حکومت کریگا۔ لیکن جب مسیح موعود آئے تو وہ ہر قسم کے تشدّد کے خلاف تھے۔ یہودی خیالات کے برعکس آپ نے حواریوں کو تعلیم دی کہ "شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اُس کے ساتھ دو کوس چلا جا" (متی ۵: ۳۹-۴۱) اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دُعا مانگو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو۔ کیونکہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے۔ چاہیئے کہ تم کامل ہو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے" (متی ۵: ۴۴-۴۸) آپ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہم ظلم کو ظلم سے ہٹا نہیں سکتے بلکہ نیکی سے بُرائی کو مغلوب کر سکتے ہیں۔ شاگردوں کو حکم ہوا کہ مدافعت اور مقابلہ کی قدرت رکھتے ہوئے جور و جفا سہیں اور اگرچہ اظہارِ غیظ و غضب میں وہ قطعاً حق بجانب ہوں تاہم انکو سررشتہ صبر و سکون ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ قدرتِ انتقام رکھتے ہوئے غصّہ

اور غضب کو مغلوب کریں۔ آپ کا مقولہ تھا کہ "جو تلوار کھینچتے ہیں وہ تلوار سے ہلاک کئے جائینگے"۔ (متی ۲۶: ۵۲) آپ کا حکم ہے کہ اُن جذبات سے کامل طور پر احتراز کیا جائے جن سے اشتعال انگیزی کا خفیف سے خفیف شائبہ بھی ہو سکتا ہو ایک دفعہ ایک گاؤں کے لوگوں نے آپ سے بدسلوکی کی۔ شاگردوں نے خفا ہو کر چاہا کہ "آسمان سے آگ برسے اور انہیں کھا جائے"۔ منجی عالمین نے اُنکو ڈانٹا اور فرمایا "تم نہیں جانتے کہ تم کس روح کے ہو کیونکہ ابن آدم انسانوں کی جانیں برباد کرنے نہیں بلکہ اُن کو بچانے آیا ہے"۔ (لوقا ۹ باب) ابن اللہ کے آخری ایام میں ایک شاگرد نے اپنے آقا اور مولا کی حفاظت کی خاطر تلوار کھینچی تو آپ نے منع کیا اور فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو فرشتوں کی بارہ فوجوں سے زیادہ میرے مخالفین کا استیصال کرنے کی خاطر حاضر ہو سکتی ہیں مگر میں تو رضائے الٰہی کو پورا کرنے آیا ہوں (متی ۲۶: ۵۱-۵۲) اور آپ نے زخمی سپاہی کو جو آپ کے خون کا پیاسا تھا شفا عطا کی (لوقا ۲۲: ۵۲) بلکہ آپ نے اپنے جانی دشمنوں کے حق میں جو آپ کو مصلوب کر رہے تھے۔ دعائے خیر کی اور کہا "اے باپ ان کو معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں"۔ (لوقا ۲۳: ۳۴) رومی گورنر نے سزائے تازیانہ وصلیب دیتے وقت آپ سے پوچھا "کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے" آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا "میری بادشاہت اِس جہان کی نہیں"۔ (یوحنا ۱۸: ۳۶) ایک دفعہ اہل یہود نے زبردستی آپ کو بادشاہ بنانا چاہا تو آپ نے انکار کر دیا۔ اور اُن کو ہکا بکا چھوڑ کر آپ وہاں سے چلے گئے (یوحنا ۶: ۱۵) آپ نے لفظ "مسیح" کے تصور میں سے تمام قومی اور سیاسی عناصر کو خارج کر دیا۔ آپ "دنیا پر غالب" آئے (یوحنا ۱۶: ۳۳) اور ہماری "نجات کے کپتان" بنے (عبرانیوں ۲: ۱۰) لیکن یہ فتح آپ نے تلوار کے زور سے یا آسمان سے آگ برسا کر حاصل نہ کی بلکہ آپ خدمت۔ فرمانبرداری

اور صلیبی موت کے ذریعہ "جلال کے بادشاہ" (زبور ۲۴: ۱۰) بنے۔
پس ثابت ہو گیا کہ منجیٔ عالمین کا یہ خیال نہیں تھا کہ آسمان کی بادشاہت کوئی دنیاوی سلطنت ہے جو تلوار کے زور سے وسیع ہوتی جائیگی بلکہ آپ کا یہ خیال تھا کہ آپ کی بادشاہت روحانی بادشاہت ہے۔ جس کے اوپر خدا نے آپکو حکمران کیا ہے۔ اہلِ یہود ایک جنگجو مسیح کے منتظر تھے جو ایک لشکر جرار لے کر روم کو مغلوب کریگا۔ اور اقوامِ عالم سے خراج وصول کریگا اور یروشلیم کے پھاٹکوں میں تختِ عدالت پر بیٹھ کر اسرائیل میں انصاف کریگا۔ لیکن یہ مسیح کہتا تھا کہ خدا کی بادشاہت نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے اس کا کوئی مرکزی مقام اور دارالسلطنت نہیں ہے (لوقا ۱۷: ۲۱) وہ قیصر روم کو خراج ادا کرنے میں کچھ ہرج نہیں سمجھتا تھا (مرقس ۱۲: ۱۳-۱۷) اہلِ یہود اس کے دعویٰ مسیحائی کو اپنے خیالات کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے۔ (مرقس ۸: ۱۱) اور بار بار اس سے تقاضا کرتے کہ "تو ان کاموں کو کس اختیار سے کرتا ہے"؟ (مرقس ۱۱: ۲۸) "کس نے تجھے یہ اختیار دیا ہے"؟ (متی ۲۱: ۲۳) اگر تو فی الحقیقت مسیح موعود ہے تو ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں"۔ (لوقا ۱۲: ۳۸) لیکن کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ جو لوگ "نشان طلب کرتے ہیں" وہ "اس زمانہ کے برے لوگ ہیں"۔ (لوقا ۱۱: ۲۹) کیونکہ ان کے دلوں کو جنگجو مسیح کے تصور نے مغلوب کر رکھا تھا۔ جب ایک شخص اس کے پاس درخواست لے کر آیا کہ اسرائیل میں انصاف کرے تو اس مسیح نے صاف انکار کر دیا (لوقا ۱۲: ۱۳-۱۴) یہ مسیح جنگجو بادشاہ بننے سے انکار کرنے پر اصرار کرتا تھا۔ (یوحنا ۶: ۱۵) جب یہودی شاطروں کی چال کامیاب ہو گئی اور آپ پکڑے گئے تو انہوں نے رومی گورنر کے پاس شکایت کی یہ شخص نہایت خطرناک ہے لیکن درحقیقت ان کی یہ شکایت تھی کہ کلمۃ اللہ خطرناک نہیں تھے پلاطس نے تو صلیب کے اوپر یہ کتبہ

لکھا تھا کہ یہ یہودیوں کا بادشاہ ہے لیکن یہود نے آپ کو مصلوب کروایا تھا کیونکہ وہ اُن کے مطلب کے موافق یہودیوں کا بادشاہ بننے سے انکاری تھے۔

پس مسیح خداوند کے خیالات آپ کے ہم عصروں کے خیالات سے بلند و بالا اور ارفع تھے یہود ایک محدود سلطنت چاہتے تھے۔ کلمۃ اللہ ایک لا محدود سلطنت کی منادی کرتے تھے آپ ایک ایسی سلطنت کے سلطان تھے جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد تھی جو الفاظ آپ نے اس سلطنت کے متعلق استعمال فرمائے وہ اس حقیقت کے مؤید ہیں (مرقس ۹: ۱+ متی ۲۱: ۴۳+ مرقس ۱۰: ۱۵+ متی ۲۵: ۳۴ + ۵: ۲۰ + ۱۳: ۴۴ - ۴۶ وغیرہ) اہل یہود کو بار بار آپ نے فرمایا کہ میری سلطنت اس دنیا کی نہیں ہے لیکن آپ نے ہمیشہ اہل یہود پر اپنا روحانی اختیار جتلایا اور اپنے آپ کو بادشاہ کہا (متی ۲۱: ۲۳+ ۲۵: ۳۴ وغیرہ) زمانہ قدیم میں سلطان السلاطین نے ابرہام سے فرمایا تھا کہ "تو اپنے مُلک اور قرابتیوں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل چل اور میں تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کرونگا (پیدا ۱۲: ۱) اور اب کنعان کی سرزمین میں ایک با اختیار سلطان نے ببانگ دہل اعلان فرمایا۔ "اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا" (لوقا ۱۴: ۲۶) کلمۃ اللہ سے عشق و محبت سرمایہ حیات اور وثیقہ نجات ہے گو آپ "داؤد کے تخت" پر بیٹھنے سے انکار کرتے تھے تاہم آپ "عجیب مشیر خدائے قادر ابدیت کا باپ سلامتی کا شہزادہ" کہلانے کو تیار تھے جسکی "سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہا نہ ہوگی"۔ (یسعیاہ ۹: ۶) گو "آپ خدا کی بادشاہت" کی منادی کرتے تھے لیکن آپ نے کبھی خدا کو اس بادشاہت کا بادشاہ نہ کہا بلکہ آپ خود اس بادشاہت کے بادشاہ تھے۔ آپ نہ صرف اس بادشاہت کے بانی

تھے۔ بلکہ خود اس کے سلطان اور مالک تھے (متی ۳:۱۱+۱۴:۱۶+۲۸:۲۰+۲۱:۲+۲۵ : ۳۴-۴۰) یہ بادشاہ اہلِ یہود کے بادشاہوں کی مانند نہ تھا جو خدا کے احکام اور مرضی پر نہیں چلتے تھے۔ بلکہ اس سلطان کو خدا کی رضا نہایت مرغوب تھی (متی ۱۱:۲۷+یوحنا ۴:۳۴+۵:۳۰+۶:۳۸ وغیرہ)

انجیل نویس اس امر پر بڑا زور دیتے ہیں کہ خداوند مسیح داؤد کی نسل سے تھے۔ لہذا داؤد کے تخت کے وارث تھے (لوقا ۱:۳۲+متی ۱:۲۰ وغیرہ) لیکن خداوند مسیح نے خود اپنے دعوے کو نسب ناموں اور دنیاوی تعلقات پر مبنی نہ کیا۔ کیونکہ آپ بادشاہ کہلانے کا اپنے آباؤ اجداد سے بہتر اور اعلیٰ حق رکھتے تھے خداوند مسیح اپنے آپ کو داؤد سے اعلیٰ اور اپنی بادشاہت کو یہودی ریاست سے افضل خیال کرتے تھے۔ (مرقس ۱۲:۳۵-۳۷) آپ سلطنت الٰہی کے بادشاہ ہیں کیونکہ آپ حقیقی معنوں میں ظل اللہ ہیں۔ آپ خدا کے مظہر ہیں۔ اور آپ کی شخصیت معرفت الٰہی کا وسیلہ ہے (متی ۱۱:۲۷+یوحنا ۱۴:۶-۹) آپ عالمگیر روحانی سلطنت کے بادشاہ ہیں۔ آپ بیس صدیوں سے ہر ملک۔ ملت۔ قوم اور طبقہ کے دلوں پر کلیسیا کے اندر اور باہر فرمانروا رہے ہیں اور تا دوام رہینگے۔

ع۔ اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا!

(۴) منجی عالمین کی صلیبی موت اور خدا کی بادشاہت

منجی عالمین نے خدا کی بادشاہت کو اپنی صلیبی موت کے ساتھ متعلق فرمایا چونکہ یہ بادشاہت جور و ظلم پر نہیں بلکہ ایذا سہنے پر مبنی تھی اور فروتنی صلیب برداری اور ایثار نفسی اس کے اعلیٰ ترین قوانین تھے (متی ۲۰:۲۸+مرقس ۱۰:۳۴-۳۸

لہٰذا ضرور تھا کہ اِس کا بادشاہ بھی حلیم اور فروتن (متّی ۱۱: ۳۰) اور صلیب بردار ہونا (لُوقا ۹: ۲۳) مُنجیٔ جہان کی وفات الٰہی سلطنت کے قیام کے لئے ایک ضروری منزل تھی (لُوقا ۲۲: ۱۵-۱۸) اِس بادشاہت میں وہ تمام فروتن اور جانباز لوگ داخل ہونگے جو دُوسروں کو اپنے سے افضل جان کر حقیر اور ادنیٰ لوگوں کی خدمت کرکے بھُولی بھٹکی بھیڑوں کی تلاش کرکے اُن میں داخل ہونے میں مدد دینگے۔ مُنجیٔ کونین کی صلیبی موت نے اِس بادشاہت کا دروازہ تمام جہان کے گنہگاروں کے لئے کھول دیا۔ (مرقس ۱۴: ۲۲-۲۵) آپ نے فرمایا کہ "ابنِ آدم اِس لئے آیا ہے کہ اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیہ میں دے" (متّی ۲۰: ۲۸) آپکی موت اور بنی آدم کی نجات میں علّت و معلُول کا رشتہ ہے آپ نے خُدا کی بادشاہت کو حاصل کرنے کا جو طریقہ بتایا وہ دُنیا جہان سے نرالا تھا اور تاریخ اِس امر کی گواہ ہے کہ یہ طریقہ ہر ملک اور ہر قوم اور ہر طبقہ کے گنہگاروں کی نجات کے لئے مؤثر اور کارگر ثابت ہُوا ہے۔ جس یُونانی لفظ کا ترجمہ "فدیہ" کیا گیا ہے۔ وہ یُونانی زبان کے ترجمہ سیپٹواجنٹ (Septuagint) میں لفظ "غفر" کو ادا کرنے کے لئے اِستعمال کیا گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ مُنجیٔ عالمین اپنی صلیبی موت کو الٰہی مغفرت کا ذریعہ خیال فرماتے تھے پس کُل اقوامِ عالم کے گنہگار اِس ذریعہ سے اپنے گناہوں کی مُعافی حاصل کرکے خُدا کی بادشاہت میں داخل ہوتے ہیں مُنجیٔ جہان نے صلیبی "موت کی تلخی" کے وسیلے "آسمان کی بادشاہت سب مومنین پر کھول دی"۔

(۵)

خُدا کی بادشاہت بہترین نصب العین ہے

کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ خُدا کی بادشاہت کا قیام ہر شخص کا نصب العین ہونا

چاہیئے۔ اُس کو ہر شے پر مقدم تصور کرنا چاہیئے آپ نے فرمایا "تم پہلے خدا کی بادشاہت اور اُس کی راستبازی کی تلاش کرو"۔ (متی ۶: ۳۳)

اس امر کو آپ نے دو تمثیلوں کے ذریعہ واضح کیا اور فرمایا "آسمان کی بادشاہت کھیت میں چھپے ہوئے خزانے کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے پاکر چھپا دیا۔ اور خوشی کے مارے جاکر جو کچھ اُس کا تھا بیچ ڈالا اور اُس کھیت کو مول لے لیا"۔ (متی ۱۳: ۴۴) ایک اور تمثیل میں آپ نے فرمایا۔ "آسمان کی بادشاہت اُس سوداگر کی مانند ہے جو عُمدہ عُمدہ موتیوں کی تلاش میں تھا جب اُسے ایک بیش قیمت موتی ملا تو جاکر جو کچھ اُس کا تھا سب بیچ ڈالا اور اُسے مول لے لیا"۔ (متی ۱۳: ۴۵-۴۶)۔

کلمۃ اللہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی بادشاہت ایک ایسی بیش قیمت شے ہے کہ دُنیا کی ہر چیز اِس کے مقابل بے حقیقت اور بے مایہ ہے چونکہ وہ مرغوب ترین اور اعلیٰ ترین مطمع ہے اِس لیئے کلمۃ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ "تم پہلے خدا کی بادشاہت اور اُس کی راستبازی کی تلاش کرو"۔ (متی ۶: ۳۳) آپ کے اِن الفاظ نے دُنیائے اخلاق میں ایک نہایت عظیم الشان تبدیلی پیدا کردی جو اشیاء مثلاً دولت حشمت۔ جاہ وغیرہ پہلے قابلِ قدر خیال کی جاتی تھیں۔ وہ یکسر بے مایہ اور بے وقعت ہوگئیں۔ والدین اور رشتہ داروں سے کورانہ محبت اور اُن کی اندھی پیروی۔ بزرگوں کی روایات کی عزت و تکریم۔ سوسائٹی کے مروجہ رسوم و قوانین۔ دُنیاوی حشمت و مرتبہ۔ لوگوں میں ہر دل عزیز شمار ہونا۔ شکم پروری۔ نفس پرستی۔ آرام و عیش کی زندگی دولت کی فراہمی وغیرہ وغیرہ یکسر بے قدر اور بے حقیقت ہوگئیں۔ اور خدا کے احکام۔ رضائے الٰہی کی پیروی۔ غربت و افلاس۔ لعن طعن کی صبر سے برداشت۔ ایثار نفسی۔ خود انکاری۔ سرفروشی۔ خلق

خُدا کی خدمت وغیرہ اعلیٰ ترین بیش قیمت اور گراں مایہ امور قرار دے دئے گئے۔
دُنیادار اشخاص اس اعلیٰ ترین مطمحِ نظر کی پروا نہیں کرتے اور دُنیوی معاملات کو اس ازلی بادشاہت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کرتوتوں کی وجہ سے لاپروا اور غافل رہ کر اس بادشاہت سے محرُوم رہ جاتے ہیں۔ اس واضح حقیقت کو مُنجیٔ عالمین نے ایک تمثیل کے ذریعہ سمجھایا اور فرمایا" ایک شخص نے بڑی ضیافت کی اور بہت سے لوگوں کو بُلایا اور کھانے کے وقت اپنے نوکر کو بھیجا کہ بُلائے ہوؤں سے کہہ کہ آؤ اب کھانا تیار ہے۔ اس پر سب نے مل کر عذر کرنا شروع کیا۔ پہلے نے اس سے کہا کہ مَیں نے کھیت خریدا ہے مُجھے ضرور ہے کہ جا کر اُسے دیکھوں۔ مَیں تیری منّت کرتا ہُوں کہ مُجھے معذُور رکھ۔ دُوسرے نے کہا مَیں نے بیلوں کی پانچ جوڑیاں خریدی ہیں اور اُنہیں آزمانے جاتا ہُوں۔ مَیں تیری منّت کرتا ہُوں کہ مُجھے معذُور رکھ۔ ایک اور نے کہا مَیں نے بیاہ کیا ہے اس سبب سے نہیں آ سکتا۔ پس اُس نوکر نے آ کر اپنے مالک کو ان باتوں کی خبر دی۔ اس پر گھر کے مالک نے غُصّے ہو کر اپنے نوکر سے کہا جلد شہر کے بازاروں اور کُوچوں میں جا کر غریبوں لُنجوں اندھوں اور لنگڑوں کو یہاں لے آ۔ نوکر نے کہا اے خُداوند جیسا تُو نے فرمایا تھا ویسا ہی ہُؤا اور اب بھی جگہ ہے۔ مالک نے اُس نوکر سے کہا کہ سڑکوں اور کھیت کی باڑوں کی طرف جا کر اور لوگوں کو مجبُور کر کے لا تاکہ میرا گھر بھر جائے کیونکہ مَیں تُم سے کہتا ہُوں کہ جو بُلائے گئے تھے اُن میں سے کوئی شخص میرا کھانا چکھنے نہ پائیگا۔" (لُوقا ۱۴: ۱۶-۲۴)

خُداوند کا یہ مطلب ہے کہ خدا دُنیا کے ہر فردِ بشر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ آسمان کی بادشاہت کو اعلیٰ جان کر تمام باتوں پر ترجیح دے کر اُس میں داخل ہونے کے لئے جدوجہد کریں لیکن جو شخص دیدہ دانستہ دُنیوی امُور کو خُدا کی بادشاہت پر فوقیت دیتا ہے اور خُدا کی دعوت کو اور بہترین نصب العین کو رد کر کے ٹھکرا دیتا ہے وہ اِس

عظیم الشان برکت سے اپنے آپ کو محروم کر دیتا ہے اور خدا کی حضوری سے خود اپنے آپ کو خارج کر دیتا ہے۔

(۶)

خدا کی بادشاہت کی حقیقت:-

کلمتہ اللہ نے چند تمثیلوں کے ذریعہ خدا کی بادشاہت کے مفہوم کو اپنے شاگردوں پر ظاہر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی بادشاہت کے رُوحانی اصول خودبخود رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں کو موہ لینگے اور وہ وسعت پاتی جائیگی۔ اِس صداقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے آپ نے دو تمثیلیں اپنے شاگردوں کو سُنائیں اور فرمایا کہ "آسمان کی بادشاہت اس خمیر کی مانند ہے جیسے کسی عورت نے لیکر تین پیمانے آٹے میں ملا دیا اور ہوتے ہوتے سب خمیر ہو گیا"۔ (متی ۱۳: ۳۳) اسی صداقت کو دُوسری تمثیل میں آپ نے ایک اور پیرایہ میں ظاہر کیا اور فرمایا" خدا کی بادشاہت ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پہلے پتی پھر بالیں بعد اس کے بالوں میں تیار دانے پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا"۔ (مرقس ۴: ۲۶-۲۹)۔

کلمتہ اللہ نے فرمایا کہ گو خدا کی بادشاہت ابتدا میں ظاہرا طور پر بالکل حقیر اور چھوٹی شے نظر آتی ہے تاہم وہ اقصائے عالم تک پھیلتی جائیگی اور اقوام عالم اُس میں شامل ہونگی۔ آپ نے فرمایا" آسمان کی بادشاہت اُس رائی کے دانے کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لیکر اپنے کھیت میں بو دیا ہو اور وہ سب ....

بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب بڑھ جاتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہوجاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں (متی ۱۳: ۳۱-۳۲)

کلمتہ اللہ نے فرمایا کہ جب اقوام عالم خدا کی بادشاہت میں شامل ہو جائینگی اور نیک و بد اُس میں داخل ہونگے تو نیکوں کی خاطر بدوں کی بدکرداری کی برداشت کی جائیگی لیکن اگر وہ اپنی بدی پر اصرار کرینگے تو اُن کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ آپ نے اِس حقیقت کو دو تمثیلوں کے ذریعہ واضح کیا اور فرمایا کہ "آسمان کی بادشاہت اُس آدمی کی مانند ہے جس نے اپنے کھیت میں اچھا بیج بویا مگر لوگوں کے سوتے میں اُس کا دشمن آیا اور گیہوں میں کڑوے دانے بھی بو کر چلا گیا۔ پس جب پتیاں نکلیں اور بالیں آئیں تو وہ کڑوے دانے بھی دکھائی دئے۔ گھر کے مالک کے نوکروں نے آکر اُس سے کہا اے خداوند کیا تُو نے اپنے کھیت میں اچھا بیج نہ بویا تھا پھر اس میں کڑوے دانے کہاں سے آگئے؟ اُس نے اُن سے کہا یہ کسی دشمن نے کیا ہے۔ نوکروں نے اُس سے کہا تو کیا چاہتا ہے کہ ہم جا کر اُنہیں جمع کریں؟ اُس نے کہا نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کڑوے دانے کے جمع کرنے میں تم اُن کے ساتھ گیہوں بھی اُکھاڑ لو۔ فصل تک دونوں کو اکٹھا بڑھنے دو اور فصل کے وقت میں کاٹنے والوں سے کہہ دونگا کہ پہلے کڑوے دانے جمع کر لو اور جلانے کے واسطے اُن کے گٹھے باندھ لو اور گیہوں میرے کھتّے میں جمع کر دو" (متی ۱۳: ۲۴-۳۰) کلمتہ اللہ نے خلوت میں شاگردوں کو اس تمثیل کا مطلب اپنی زبانِ حقائق ترجمان سے یُوں سمجھایا کہ "اچھے بیج کا بونے والا ابنِ آدم ہے اور کھیت دُنیا اور اچھا بیج بادشاہت کے فرزند اور کڑوے دانے اُس شریر کے فرزند۔ جس دشمن نے اُن کو بویا وہ ابلیس ہے اور فصل دُنیا کا آخر اور کاٹنے والے

فرشتے۔ پس جیسے کڑوے دانے جمع کئے جاتے اور آگ میں جلائے جاتے ہیں ویسے ہی دُنیا کے آخر میں ہوگا۔ ابنِ آدم اپنے فرشتوں کو بھیجیگا اور وہ سب ٹھوکر کھلانے والی چیزوں اور بدکاروں کو اُس کی بادشاہت میں سے جمع کرینگے۔ اور اُس وقت راستباز اپنے باپ کی بادشاہت میں سے جمع کرینگے اور اُس وقت راستباز اپنے باپ کی بادشاہت میں آفتاب کی مانند چمکینگے" (متّی ۱۳: ۳۷-۴۳)

خداوند نے ایک اور تمثیل سے اِسی صداقت کو واضح کیا اور فرمایا کہ "آسمان کی بادشاہت اُس بڑے جال کی مانند ہے جو دریا میں ڈالا گیا اور اُس نے ہر قسم کی مچھلیاں سمیٹ لیں اور جب بھر گیا تو اُسے کنارے پر کھینچ لائے اور بیٹھ کر اچھّی اچھّی تو برتنوں میں جمع کر لیں اور بُری بُری پھینک دیں۔ دُنیا کے آخر میں ایسا ہی ہوگا کہ فرشتے نکلینگے اور شریروں کو راستبازوں میں سے جُدا کرینگے"۔ (متّی ۱۳: ۴۷-۴۹)۔

پس خداوند مسیح نے یہ تعلیم دی ہے کہ خدا کی بادشاہت کی جڑ انسان کے دل میں کلام اللہ اور حق اور رُوح کے ذریعہ قائم ہوتی ہے (متّی ۱۳: ۱۹+ یوحنّا ۱۸: ۳۷+۳: ۵ و ۶) اور انسانی طبیعت کو کُلیتہً تبدیل کر دیتی ہے۔ (متّی ۱۸/۳) جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان خدا کی مرضی پر چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ (متّی ۷: ۲۱)

پس یہ بادشاہت غیر مرئی۔ باطنی اور زندگی بخش ہے (لوقا ۱۷: ۲۱) وہ انسان کو خدا کی قربت اور رفاقت عطا کرتی ہے۔ اور اِس کے باطن میں ایک "نیا دل" اور "مستقیم رُوح" (زبور ۵۱: ۱۰) پیدا کر دیتی ہے اور اِس کی اخلاقی زندگی از سرِ نو نشوونما پانے لگ جاتی ہے یہ بادشاہت ترقی کرتی جاتی ہے اور تمام

اقوام عالم میں پھیل جاتی ہے یہاں تک کہ ایک " نیا آسمان" اور نئی زمین " خلق ہو جاتے ہیں اور اس دُنیا کے ہر شعبہ پر ایسا زبردست اثر پڑتا ہے کہ اُسکی کایا پلٹ جاتی ہے۔

(۷)

خُدا کی بادشاہت کی آمد :-

چونکہ خُدا کی بادشاہت ظاہری شے نہیں بلکہ باطنی اور اندرُونی ہے۔ (لُوقا ۱۷: ۲۰) لہٰذا وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو عالمِ وجُود کے ساتھ تعلق رکھتی ہے چُنانچہ فریسیوں نے ایک دفعہ کلمۃ اللہ سے استفسار کیا کہ خُدا کی بادشاہت کب آئیگی۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ خُدا کی بادشاہت تمہارے اندر موجود ہے (لوقا ۱۷: ۲۰-۲۱) آپ نے ایک تمثیل کہی اور فرمایا کہ خُدا کی بادشاہت خمیر کی مانند ہے جو سب آٹے کو خمیر کر دیتا ہے (متی ۱۳: ۳۳) پس آسمانی بادشاہت ایک اصُول ہے جو باطنی طور پر ہر فردِ بشر کے دل میں تاثیر پیدا کرتا ہے۔ مُنجیٔ جہان کی خدمت اور آپ کے اقوال و افعال نے دُنیا کی شیطانی حکومت پر دھاوا بول دیا ہے اور ایک نیا دور اس دُنیا پر شروع ہو گیا ہے۔ "خُدا کی بادشاہت تمہارے پاس آ پہنچی"۔ (لُوقا ۱۱: ۲۰) اس بادشاہت کے پھاٹک کھل گئے ہیں اور جو انسان شیطان پر حملہ آور ہوتے ہیں وہ اس میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ (متی ۱۱: ۲۰) خُداوند کے پیش رو یُوحنّا کے زمانہ تک شریعت حکمران تھی اُس وقت سے خُدا کی بادشاہت کی خوشخبری دی جاتی ہے جس میں ہر ایک جوشیلا شخص شیطان سے جنگ کر کے داخل ہوتا ہے۔ (لُوقا ۱۶: ۱۶) یہاں تک کہ تائب محصُول لینے والے اور رجُوع لانے والی کسبیاں گناہوں کی مغفرت حاصل کر کے خُدا کی بادشاہت میں فریسیوں سے پہلے داخل ہوتی ہیں۔ (متی ۲۱: ۳۱)

پس ظاہر ہے کہ خداوند مسیح کے لئے خدا کی بادشاہت ایک موجودہ حقیقت تھی جو آپ کی منادی اور ذاتِ الٰہی کے نئے مکاشفہ کی وجہ سے ظہور میں آئی تھی۔ آپ کا یہ خیال تھا کہ یہ بادشاہت چند افراد سے شروع ہو کر خمیر کی طرح زمانہ مستقبل میں اقصائے عالم میں پھیل جائیگی۔ آپ کا یہ خیال نہیں تھا۔ کہ یہ بادشاہت یک لخت اعجازی طور پر محض خدا کی قدرت کے ذریعہ عالم وجود میں آجائیگی۔ یہ یہودی ربیوں کا خیال تھا لیکن کلمۃ اللہ کا یہ خیال تھا۔ کہ انجیل جلیل کے محبت آمیز پیغام کے ذریعہ اور آپ کی بے نظیر شخصیت اور لاثانی مکاشفہ کے ذریعہ خدا کی بادشاہت کی حدود ہمیشہ بڑھتی جائینگی یہاں تک کہ کل اقوام عالم اس سلطنت میں شریک ہو جائینگی۔ اور خدا کی مرضی "جس طرح آسمان پر پوری ہوتی ہے۔ زمین پر بھی پوری ہوگی۔ یہودی ربیوں کا قول تھا کہ یہ بادشاہت بغیر انسانی کوشش کے قائم ہو گی لیکن کلمۃ اللہ کو یہ احساس تھا کہ اس مقصد کی تکمیل میں آپ کو اور آپ کے حواریوں کو سر توڑ کوشش کرنی پڑیگی یہاں تک کہ آپ کو صلیبی موت کی برداشت کرنی پڑیگی اور آپ کے شاگردوں کو ہر طرح کی ایذا اور مصیبت سے جان جوکھوں کا مقابلہ کرنا پڑیگا۔ آپ کا یہ ایمان تھا۔ کہ یسعیاہ نبی باب ۵۳ کی پیشین گوئی کا اطلاق صرف آپ پر ہی ہوتا ہے اور آپ خود خداوند کے وہ خادم اور رسول ہیں جو "اندھوں کی آنکھیں کھولیگا۔ اور بندھوؤں کو قید سے نکالیگا۔ اور اُن کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانے سے چھڑائیگا۔ (یسعیاہ ۴۲: ۷) اور جس کے وسیلے خدا کی مرضی بر آئیگی۔ جو "اپنی معرفت کے وسیلہ بہتوں کو راستباز ٹھہرائیگا" (یسعیاہ ۵۳: ۱۰-۱۱) منجئ کونین نے اپنے مکاشفہ کے وسیلے خدا کی بادشاہت کو تمام دنیا پر ظاہر کیا اور یہ تعلیم دی کہ راست بازی اور محبت کے ذریعہ ہر ملت، قوم اور طبقہ کا شخص اس

بادشاہت میں شریک ہو سکتا ہے۔ آپ کی اخلاقی تعلیم اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ آپ کا یہ خیال نہ تھا کہ یہ بادشاہت ایک لحظہ میں محض الٰہی دستِ قدرت سے ظہور پذیر ہوگی۔ بلکہ آپ کا خیال تھا کہ اخلاقی جدوجہد کے ذریعہ شیطانی امور کا مقابلہ کرنے سے یہ بادشاہت روئے زمین پر قائم ہوگی اور اکناف عالم تک وسعت پائیگی تاحدیکہ کل بنی نوع سعید بن کر اس میں داخل ہو جائینگے +

(۸)

خداوند مسیح کی آمدِ ثانی:-

اناجیل میں ہمیں چند فقرات ایسے بھی ملتے ہیں۔ جن سے یہ مترشح ہوتا ہے۔ کہ خداوند مسیح کا یہ خیال تھا کہ الٰہی سلطنت جلدی ظہور پذیر ہوگی۔ (مرقس باب ۱۳ + متی ۲۴ باب) ان ابواب اور فقرات کی بنا پر بعض نقاد بالخصوص البرٹ شویٹزر Albert Schweitzer کہتے ہیں کہ خداوند جب اس دنیا میں تھے تو وہ اپنے آپ کو مسیح موعود تصور نہیں کرتے تھے۔ بلکہ آپ کا خیال تھا کہ آپ تب مسیح ہونگے جب آپ آمدِ ثانی کے وقت جلال کے ساتھ واپس آئینگے اور آپ کی وفات کے بعد ہی خدا خوارقِ عادت طور پر آپ کی حمایت کریگا اور آپ مسیح ہو کر آسمان سے واپس آئینگے اور اس دنیا کو تباہ کر کے ایک نئی دنیا قائم کرینگے۔ پس آپ درحقیقت اخلاقیات کے اُستاد نہ تھے کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ آپ کی آمدِ ثانی چند دنوں میں ہی وقوع پذیر ہوگی اور خدا کی سلطنت یک لخت الٰہی دستِ قدرت کے وسیلے قائم ہو جائیگی۔ پس آپ کے اخلاقی اُصول محض اس تھوڑی مدت کے وقفہ کے لئے وضع ہوئے تھے کیونکہ آپ کے خیال میں آپ کی آمدِ ثانی نہایت

قریب تھی۔ آپ کا حقیقی منشا یہ تھا کہ اپنے حواریین کو آمدِ ثانی کے اعجازی واقعہ کے لئے تیار کریں۔ تاکہ اِس اثنا میں وہ تمام دُنیاوی تعلقات کو قطع کر سکیں۔[۲]

لیکن جب ہم مذکورہ بالا ابواب کا غور سے مطالعہ کرتے ہیں تو اِن اِنتہا پسند نقّادوں کی رائے کی خامی ہم پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اناجیل میں چند فقرات ایسے موجود ہیں۔ جن سے یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ خُداوند کے خیال میں آپ کی آمدِ ثانی بعید نہیں تھی۔ بلکہ قریب زمانہ میں واقع ہونے والی تھی۔ لیکن اِس بنیاد پر اِن نقّادوں نے ایک عظیم الشان نظریہ کھڑا کر دیا ہے کہ بے اِختیار منہ سے نکل جاتا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا می رود دیوار کج

اناجیل کے تواریخی مطالعہ سے خُدا کی بادشاہت کی آمد کے متعلق ذیل کے امور ہم پر ظاہر ہو جاتے ہیں :-

(۱) جیسا ہم سطورِ بالا میں ثابت کر آئے ہیں خُداوند مسیح کا خیال تھا کہ الٰہی بادشاہت آپ کی عینِ حیات میں ہی قائم ہو گئی ہے اور وہ ہمیشہ وسیع ہوتی جائیگی (متی ۱۱: ۱۱ + مرقس ۴: ۲۶-۲۹)

(۲) یہ سلطنت یک لخت اعجازی طور پر قائم نہیں ہو گی بلکہ خمیر کی طرح پھیلتی جائیگی جس کی اشاعت کے لئے منجیِ عالمین نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا تھا۔ (متی ۱۳: ۳۱-۳۳)

(۳) چونکہ قوم یہود نے خدا کی محبت کی پروا نہیں کی بلکہ اُس کے پیغام کو ٹھکرا دیا لہٰذا اُس پر سزا کا حکم زمانۂ قریب میں ہوگا۔ (متی ۲۳ : ۳۸)

(۴) آپ نے فرمایا کہ دُنیا کا موجودہ دور ختم کر دیا جائیگا اور ایک نیا دور شروع ہوگا جس میں الٰہی رضا سب پر حاوی ہوگی لیکن جب شاگردوں نے پوچھا کہ یہ باتیں کب ہونگی اور تیری حضوری اور زمانے کی تکمیل کا نشان کیا ہوگا (متی ۲۴ : ۳) آپ نے جواب میں فرمایا کہ "اُس دن اور اُس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ بیٹا صرف باپ" (متی ۲۴ : ۳۶)

اگر اناجیل کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری امر میں اناجیل کی آواز متفقہ نہیں ہے اور نہ صرف اُن کے الفاظ یکساں نہیں بلکہ ان کے لہجہ میں بھی فرق دکھائی دیتا ہے جس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ اِس امر کا اِمکان ہے کہ حواریوں اور انجیل نویسوں نے خداوند کے کلماتِ طیبات کی اپنے خیالات کے مطابق سمجھنے کی کوشش کر کے آپ کے مُبارک الفاظ کو بغیر جانے بُوجھے بے خبری سے یہودی خیالات کے رنگ میں رنگ دیا۔ چونکہ خداوند کے بہت سے ایسے کلمات تھے جن کو سمجھنے سے حواری قاصر رہتے تھے۔ (متی ۱۵ : ۱۶+۱۷ : ۹-۱۱+مرقس ۸ : ۱۷ و ۲۱ وغیرہ) یہ اغلب ہے کہ خداوند کی آمدِ ثانی اور الٰہی سلطنت کے قیام و وسعت کے لطیف اشارات اور کنایہ کو وہ سمجھنے سے قاصر رہے ہوں اور آپ کے خیالات کو یہودی ربیوں کے خیالات کے مطابق سمجھ لیا ہو جن کا یہ خیال تھا کہ مسیح کی بادشاہت کو خدا ایک تخت قائم کریگا ہم جانتے ہیں کہ آمدِ ثانی کے متعلق انجیل نویسوں نے اپنی سمجھ کے مطابق چند امور کو اِس طرح سمجھا جس طرح خداوند نے نہیں فرمایا تھا۔ مثلاً انجیل متی میں "اوّل اور آخر" کی تعلیم آمدِ ثانی کے متعلق کر دی گئی ہے۔ (۱۹ : ۳۰) حالانکہ دراصل اِس کا

تعلق آمدِ ثانی کے ساتھ نہیں بلکہ موجودہ زندگی کے چال چلن کے ساتھ تھا۔ (مرقس ۹: ۳۵ + ۱۰: ۳۱ + لوقا ۲۲: ۲۶) اسی طرح انجیل لوقا میں بے انصاف قاضی کی تمثیل آمدِ ثانی کے متعلق کر دی گئی ہے (۱۸: ۷ و ۸) حالانکہ اس کا اصلی تعلق "ہر وقت دعا مانگنے اور ہمت نہ ہارنے" کے ساتھ ہے (۱۸: ۱) انجیل چہارم میں آمدِ ثانی کے متعلق خداوند کا ایک قول درج ہے جس کا مطلب شاگردوں نے غلط سمجھا (یوحنا ۲۱: ۲۲-۲۳) پولوس رسول کے خط (۲ تھسلنیکیوں ۲ باب) سے بھی ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ خداوند کی آمدِ ثانی کے خیالات کو یہودی تصورات کس قدر متاثر کر رہے تھے۔

پس نہایت اغلب ہے کہ شاگرد اس تعلیم کو جو کلمتہ اللہ نے آمد ثانی کے متعلق دی تھی نہ سمجھے ہوں اور اپنے ہمعصروں کے خیالات کے مطابق آپ کے الفاظ کو سمجھ کر ان خیالات کو انجیل میں جگہ دے دی ہو۔ یہ نتیجہ اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ سر جے۔ سی۔ ہاکنس (Sir J. C. HAWKINS) جیسا محتاط نقاد اس امر کو قبول کرنے کو تیار ہے کہ مرقس باب ۱۳ آیات ۷ و ۸ تا ۲۰ و ۲۴ تا ۲۷ و ۳۰ الخ میں کسی یہودی مکاشفہ کا حصہ موجود ہے۔ انگریز عالم آر۔ ایچ۔ چارلس (R. H. Charles) بھی اس خیال کا حامی ہے گو ممکن ہے کہ یہ نظریہ درست نہ ہو تاہم یہ یقینی امر ہے کہ یہ فقرات خداوند کے خیالات کے عکس نہیں بلکہ حواریوں کے خیالات کے عکس ہیں۔

اس بات کے متعلق ایک اور امر قابل غور ہے۔ اس رسالہ کے مقدمہ میں ہم نے تنقید کے نتائج بیان کئے تھے اور یہ ذکر کیا تھا کہ انجیل کا ایک حصہ ہے جس کو ہم نے حرف تہجی ک سے موسوم کیا تھا جو کلمتہ اللہ کے کلمات طیبات پر مشتمل ہے اور جو غالباً آپ کی حین حیات میں لکھا گیا تھا۔ اس حصہ ک میں یہ آیات جن میں

آمد ثانی کا زمانہ قریب ہیں ذکر ہے بالکل نہیں پائی جاتیں چنانچہ ڈاکٹر ریشڈال مرحوم (Rashdall) کہتاہے کہ "یہ یقینی امر ہے کہ ان آیات میں سے ایک آیت بھی ک میں نہیں پائی جاتی" پس یہ گمان یقین کا درجہ حاصل کر لیتاہے کہ یہ آیات کلمتہ اللہ کے خیالات کو ظاہر نہیں کرتیں بلکہ جوابیوں کے خیالات کا اظہار کرتی ہیں

اس نتیجہ کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ یہ نتیجہ ابن اللہ کے اقوال و افعال کے مطابق ہے اگر خداوند نے یہ فی الحقیقت فرمایا تھا کہ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو یہاں کھڑے ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ جب تک ابن آدم کو اُس کی بادشاہت میں آتے ہوئے نہ دیکھ لینگے موت کا مزہ ہرگز نہ چکھینگے" (متی ۱۶: ۲۸) اور وقائع نگار نے ابن اللہ کے مفہوم کو صحیح طور پر ادا کیاہے تو آپ کی لاثانی تعلیم اور زرّیں اصول بے معنی ہو جائینگے اگر آپ نے درحقیقت شاگردوں سے فرمایا تھا کہ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم اسرائیل کے سب شہروں میں نہ پھر چکوگے کہ ابن آدم آجائیگا" (متی ۱۰: ۲۳) تو آپ کا شاگردوں کو یہ فرمانا اور حکم دینا بے معنی ہوگا کہ "تم جاکر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور انہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام پر بپتسمہ دو۔ اور اُنہیں یہ تعلیم دو کہ ان سب باتوں پر عمل کریں جن کا مَیں نے تم کو حکم دیا ہے اور دیکھو میں دُنیا کے آخر تک ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں" (متی ۲۸: ۱۹-۲۰) علاوہ ازیں ایسے اقوال کلمتہ اللہ کی تمثیلوں اور آپ کے روحانی اصول کے نقیض ہیں جن سے یہ معلوم ہوتاہے کہ خدا کی بادشاہت ایک روحانی اور باطنی حقیقت ہے جو رفتہ رفتہ دُنیا کو متاثر کرکے وسعت پکڑتی جائیگی۔ کلمتہ اللہ کے عالمگیر اصول بے معنی ثابت ہونگے اگر وہ صرف چند ماہ کے وقفہ کے لئے وضع کئے گئے تھے اور انتہا پسند نقاد راستی کی جانب ہونگے جو کہتے ہیں کہ آپ درحقیقت اخلاقیات کے اُستاد نہ تھے

لیکن ہم اِس بات سے گریز نہیں کر سکتے کہ مُمکن ہے کہ خُداوند مسیح نے اپنی
خدمت کے دوران میں بعض دفعہ یہ خیال کیا ہو کہ الہٰی سلطنت کے قیام اور
وُسعت کے لئے کروڑہا سال کی مُدّتِ مدید کی ضرورت نہیں ہوگی بہت اغلب
ہے کہ آپ کی خدمت میں بعض اوقات ایسے اُمید افزا حالات پیدا ہو گئے ہوں
کہ آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ خُدا کی بادشاہت جلدی پھیل جائیگی۔ ہم
جانتے ہیں کہ ایک دفعہ جب ستر شاگرد منادی کر کے واپس خُداوند کے پاس
آئے تو حالات ایسے اُمید افزا اور حوصلہ دہ تھے کہ آپ نے فرمایا "مَیں شیطان
کو بجلی کی طرح آسمان سے گرا ہُوا دیکھ رہا تھا" (لُوقا ۱۰: ۱۷-۲۴) لیکن خدمت
کے آخر میں صُورتِ حالات دِگرگوں ہو گئی۔ حوصلہ شکن حالات نے پہلے خیالات
کو منجیٔ عالمین کے دِل سے نکال دیا اور آپ نے محسُوس کر لیا کہ انجیل کی
خوشخبری رفتہ رفتہ اِس دُنیا کو متاثر کر کے خُدا کی بادشاہت کو پھیلائیگی۔

ہم اپنے ملک ہند کے حالات سے ایک مثال لے کر اس امر کو واضح کر
سکتے ہیں ۱۹۲۱ء میں ترکِ موالات کے دِنوں میں ہندوستان کے ہندو
اور مسلمان ایک دُوسرے سے اختلاط کرنے لگ گئے تھے اور ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ اندریں حالات سوراجیہ دُور نہیں۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ ہندوستان
کو ایک سال کے اندر اندر سوراج مِل جائیگا۔ لیکن مابعد کے واقعات نے
اِس خیال کو مہاتما جی کے دِل سے نکال دیا۔ اور اُنکا حوصلہ ایسا پست ہو گیا
کہ وہ سیاسی اُمور کو چھوڑ چھاڑ کئی سالوں تک الگ ہو گئے تھے اور وہ یہ محسُوس
کرنے لگے کہ عوام الناس کے دِلوں میں رفتہ رفتہ سوراجیہ کا خیال پیدا ہُوئے
بغیر سوراج مِلنا محال ہے۔

پس مُمکن ہے کہ جب خُداوند نے شہروں کے شہر۔ گاؤں کے گاؤں اور جمِ غفیر

کو نخوشی خاطر اپنی تعلیم سُنتے دیکھا تو آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ اگر چندے ایسے ہی اُمید افزا حالات جاری رہے تو خُدا کی بادشاہت جلدی قائم ہو جائیگی لیکن مابعد کے مایوس کُن اور حوصلہ شکن حالات نے خُداوند کے خیالات کو تبدیل کر دیا ہو اور آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ خُدا کی بادشاہت پھیلیگی ضرور لیکن رفتہ رفتہ۔ یہاں تک کہ تمام دُنیا میں خُدا کی بادشاہت قائم ہو جائے گی جو ابدالآباد رہیگی۔

(۹)

ابدی زندگی اور بقا۔

اس حیات مستعار کے بعد کی زندگی کے متعلق ڈاکٹر سامنڈ (Salmond) کے الفاظ ہم کو ملحوظ خاطر رکھنے چاہئیں یہ لائق مُصنف کہتا ہے کہ "اناجیل میں خُداوند کے کُل اقوال مندرج نہیں اور نہ آپ کی تعلیم ترتیب وار مختلف مضامین کے عنوان سے سلسلہ وار تحریر کی گئی ہے اُن اقوال سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خداوند کا مقصد یہ تھا کہ آخری امور یا حیات بعد از ممات کے مسئلہ پر مبسوط اور مفصل بحث کریں۔ آپ کے الفاظ معنی خیز تھے لیکن اناجیل یہ دعویٰ نہیں کرتیں کہ آپ کا مُدعا یہ تھا کہ آخری امور اور حیات بعد از ممات کی نسبت کامل مکاشفہ عطا فرمائیں"[۲۶]

پس ان آخری امور اور حیات بعد از ممات وغیرہ کے مسائل خُداوند کی تعلیم کی روشنی میں ہی حل ہو سکتے ہیں کیونکہ کلمتہ اللہ نے ان مسائل پر اپنی زبان معجز بیان سے مفصل بحث نہیں کی لیکن آپ کی خوشخبری نے زندگی اور بقا کے مسئلوں کو روشن کر دیا ہے۔ (۲ تمطاؤس ۱: ۱۰)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلمۃ اللہ نے اس سلسلہ میں بعض الفاظ اپنی زبان مبارک سے نکالے تھے تاکہ اہل یہود آپ کے خیالات کو جو آپ ہمیشہ کی زندگی کی نسبت رکھتے تھے سمجھ سکیں۔ خداوند نے یہ تعلیم دی ہے کہ جو لوگ خدا کی بادشاہت میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کی زندگی پاتے ہیں جو اسی دنیا میں شروع ہو جاتی ہے جب آپ نے فرمایا کہ "خدا کی بادشاہت تمہارے اندر ہے"۔ (لوقا ۱۷: ۲۱) تو آپ نے عبرانی انبیا اور یہودی ربیوں اور اپنے ہم عصروں کے خیالات کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ خدا پر ایمان لانے اور اعمال صالح کرنے سے ہی انسان خدا کی بادشاہت میں جو ایک موجودہ حقیقت ہے داخل ہو سکتا ہے۔ (لوقا ۶: ۴۶) ہمیشہ کی زندگی میں جو اب دنیا میں موجود ہے وہ شخص داخل نہیں ہوتا جو اپنی زبان سے عقیدہ کے چند الفاظ نکالتا ہے۔ "جو مجھ کو اے خداوند اے خداوند کہتے ہیں اُن میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگا"۔ (متی ۷: ۲۱) بلکہ ہمیشہ کی زندگی میں وہ داخل ہوتا ہے جو توبہ کر کے از سر نو خدا کی طرف رجوع کرتا اور اپنی زندگی روحانی اصول کے مطابق بسر کرتا ہے (یوحنا ۳: ۵) مقدس پولوس رسول کے الفاظ میں روحانیت ہی "زندگی اور اطمینان ہے"۔ (رومیوں ۸: ۶) یہ ہمیشہ کی زندگی اسی دنیا میں ایک موجودہ حقیقت ہے جس کا زمانہ اور وقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ ابدیت سے وقت کا کوئی علاقہ نہیں۔ ابدیت کا مطلب متعدد یا لامحدود سالوں یا صدیوں سے نہیں ہے بلکہ لفظ "ابدی" صفت ہے اور لفظ "زندگی" موصوف ہے زندگی اور موت اخلاقی حالتوں کا نام ہے زندگی ایک نئی روحانی حالت ہے جس سے مراد وہ رفاقت ہے جو ابن اللہ کے ذریعہ ہم کو خدا کے ساتھ حاصل ہوتی ہے

اور ابدی زندگی سے مراد اس رُوحانی رفاقت کی کاملیت ہے۔ یہ زندگی لازوال اور لاتبدیل ہے۔ خُدا نے اپنے ابن کے ذریعہ ہم کو ایسی زندگی کا مژدہ نہیں دیا جو صدیوں تک قائم رہیگی۔ رُوح ان معنوں میں غیر فانی نہیں کہ وہ "ہمیشہ" "زمانوں کے آخر تک" رہیگی بلکہ ہم کو یہ مکاشفہ مِلا ہے کہ ابدی زندگی باپ کے ساتھ رفاقت رکھنے سے اِسی فانی زندگی میں حاصل ہوتی ہے زندگی اور قیامت کا یہ مفہوم انجیل چہارم میں تقریباً ہر صفحہ پر ملتا ہے۔ کلمتہ اللہ نے فرمایا "میں اس لئے آیا ہوں کہ وہ زندگی پائیں اور کثرت سے پائیں" (یوحنا ۱۰: ۱۰) "جو میرا کلام سُنتا اور میرے بھیجنے والے کا یقین کرتا ہے اُس نے ہمیشہ کی زندگی حاصل کرلی ہے"۔ (یوحنا ۵: ۲۴) "ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خُدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں" (یوحنا ۱۷: ۳) آپ نے فرمایا "قیامت اور زندگی میں ہوں جو مجھ پر ایمان لاتا ہے گو وہ مرجائے تو بھی زندہ رہیگا اور جو کوئی زندہ ہے اور مجھ پر ایمان لاتا ہے وہ ابد تک کبھی نہ مریگا"۔ (یوحنا ۱۱: ۲۵-۲۶)

(۱۰) خُدا کی بادشاہت کے قوانین

حضرت موسیٰ کو خدا نے ایک پہاڑ کوہ سینا پر شریعت عطا کی۔ لہٰذا یہ موزوں تھا کہ سرورِ انبیاء (لوقا ۱۱: ۳۲) جس کی بادشاہت کا ادنیٰ ترین ممبر خاتم الانبیا حضرتِ یوحنا (متی ۱۱: ۱۳) سے بھی بڑا ہے (متی ۱۱: ۱۱) ایک پہاڑ پر سے اپنی بادشاہت کے قوانین صادر فرماتے۔ یہ قوانین انجیل اول میں ایک جگہ جمع کئے گئے ہیں (باب پنجم تا باب ہفتم) اور عموماً "پہاڑی وعظ" کے نام سے موسوم ہیں۔ موسوی شریعت خوف اور دہشت سے شروع ہوئی تھی جس

سے بدن پر لرزہ پڑ جاتا تھا لیکن یہ قوانین برکاتِ خداوندی سے شروع ہوتے ہیں۔ تمام دُنیا کی لٹریچر میں ایسے چھوٹے مطلب خیز۔ لاثانی جملے اور مقولے جیسے کلمۃ اللہ کی زبان معجز بیان سے صادر ہوئے ہیں ملنے محال ہیں جس طرح آپ کے کلماتِ طیبات بے نظیر ہیں اسی طرح آپ کے خیالات بھی نرالے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں جو غمگین اور حلیم ہیں۔ سامعین جو یونانی رومی دُنیا کی مادی ترقی اور جاہ و جلال کے پاؤں تلے روندے جانے کے عادی تھے اِن مبارک الفاظ کو سُن کر چونک پڑے ہونگے اِن میں سے بہت سے ایسے تھے جو غریب اور مسکین تھے جن کے دِلوں کے آنسوؤں نے پژمردہ کر رکھا تھا اور جو اپنی ناگفتہ بہ حالت کو قہرِ خداوندی سے منسوب کرتے تھے کلمۃ اللہ ان کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ درحقیقت مبارک حال ہیں یہ اُستادِ ازل اپنے سامعین کو بتلاتا ہے کہ وہ اشخاص بھی مبارک ہیں جو راستبازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں۔ جو رحم دِل اور پاک دل اور صُلح کے گرویدہ ہیں دُنیا ایسے اشخاص کو اِن باتوں کی خاطر ضرور ستائیگی لیکن یہ برگزیدہ اشخاص لعن طعن کی پروا نہ کرینگے۔ بلکہ خوش و شادمان ہونگے کیونکہ خُدا کی بادشاہت اُنہیں کی ہے۔ ان چیدہ ہستیوں کی تعداد تھوڑی ہوگی لیکن وہ زمین کے نمک اور دُنیا کے نُور ہونگے جو تاریکی کے فرزندوں کے رہنما ہونگے تاکہ اُن کو آفتابِ صداقت کے قدموں میں لائیں۔

ع ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شُد

مُنجئ عالمین اِبتدا میں اپنے قوانین اور موسوی شریعت میں رشتہ اور تعلّق بتاتے ہیں۔ انبیائے سلف کی شریعت باطل نہ تھی لیکن غیر مکمل تھی۔ ابن اللہ کی بعثت کی وجہ یہ تھی کہ اِس نامکمل اور ظاہری شریعت کی تکمیل

کی جائے۔ چنانچہ صاحبِ اختیار کلمۃ اللہ (مرقس ۱: ۲۲) نے اپنی رُوحانی شریعت کا چند ایک قدیم شرعی قوانین پر اطلاق فرماکر اِس بات کو واضح کردیا۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ شرعی حکم "تُو خون نہ کر"۔ (خروج ۲۰: ۱۳) کا مطلب محض جان سے مارنا ہی نہیں بلکہ کسی سے ناجائز غصّہ کرنا یا کسی کو بنظرِ حقارت ونفرت دیکھنا اُس کا خون کرنا ہے جس کی سزا جناب باری سے ضرور ملیگی اِسی طرح شرعی حکم "تُو زنا نہ کر" (استثناء ۵: ۱۸) کی نسبت فرمایا کہ زنا محض ظاہری فعل کا ہی نام نہیں بلکہ بُری خواہش زنا کی مترادف ہے پس ہم کو اس سے محترز رہنا چاہیئے۔ کلمۃ اللہ نے حالتِ ازدواج کو دائمی قرار دے دیا اور طلاق اور اُس کے بدنتائج کا قلع قمع کر دیا۔ شرعی حکم "تو جھوٹی قسم نہ کھا" (احبار ۱۹: ۱۲) کی نسبت آپ نے فرمایا کہ جھوٹی یا سچّی قسم کھانے کی مطلق ضرورت ہی نہیں کیونکہ کوئی کلام ایسا نہیں جو خُدا کی حضوری میں نہ کیا جاتا ہو۔ انتقامی شرعی قوانین (خروج ۲۱: ۲۴ + احبار ۱۹: ۱۸) کی نسبت آپ نے فرمایا کہ یہ قوانین زمانہ سلف کے لوگوں کے دلوں کی سختی کی وجہ سے وضع کئے گئے تھے لیکن انتقام کی خواہش ایک بُرا جذبہ ہے جو انسانی طبائع کو نیکی کی طرف مائل نہیں کرسکتا۔ اگر بدی کا مقابلہ بدی سے کیا جائے تو دُنیا میں نیکی کس طرح پھیل سکیگی؟ لہذا خُداوند نے فرمایا "شریر کا مقابلہ نہ کرنا" تاکہ بدی کو نیکی سے مغلوب کیا جائے۔ "دشمنوں سے محبّت رکھو اور ستانے والوں کے لیئے دُعا مانگو" تاکہ تُم اپنے آسمانی باپ کے بیٹے کہلانے کے مستحق ٹھہرو کیونکہ وہ اپنے سُورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے۔ پس چاہیئے کہ تُم کامل ہو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے"۔

خُداوند مسیح نے یہ حکم دیا کہ راستبازی کے کام محض آدمیوں کو دکھاوے کی خاطر نہ کئے جائیں۔ ریاکاری کی آلائش تک بھی موجود نہ ہو مثلاً جب خیرات

کی جائے تو کوچوں اور شاہراہوں میں نہ کی جائے تاکہ لوگ خیرات کرنے والے کی بڑائی کریں۔ بلکہ خیرات پوشیدہ ہونی چاہیئے۔ یہاں تک کہ "جو تیرا دہنا ہاتھ کرتا ہے اُسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے"۔ اِسی طرح روزہ اِس واسطے نہ رکھا جائے کہ لوگ روزہ دار جانیں بلکہ روزے کا کسی کو علم تک نہ ہونا چاہیئے جب خُدا سے دُعا کی جائے تو بازاروں کے موڑوں پر کھڑے ہو کر لمبی چوڑی دُعا نہ کی جائے اور مقصد یہ نہ ہو کہ لوگ اُن کو مردِ دُعا کہیں بلکہ دُعا پوشیدگی میں کوٹھڑی کے اندر دروازہ بند کر کے کی جائے۔ کلمۃ اللہ نے اپنے حواریوں کو ایک مختصر دُعا بطورِ نمونہ سکھائی جس میں گویا دریا کوزہ میں بند کر دیا ہے آپ نے اس دُعا کے ذریعہ یہ تعلیم دی کہ انسان کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ وہ خُدا کی مرضی پر چلے تاکہ خُدا کی بادشاہت زمین پر بھی قائم ہو جس طرح وہ آسمان پر موجود ہے تاکہ آسمانی باپ کے نام کی تقدیس ہو۔ انسانی حاجتیں اِسی اعلیٰ ترین مقصد کے ماتحت ہیں۔ روزانہ ضروریات کا پورا ہونا گناہوں کی مغفرت اور بُرائی سے بچنا۔ اِسی اعلیٰ مطمحِ نظر کو حاصل کرنے کا وسیلہ ہیں۔

منجیٔ عالمین کی تعلیم میں زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ہم خُدا اور اُس کی مرضی کو تمام باتوں پر ترجیح دیں۔ اگر ہم خُدا پر کامل بھروسا رکھینگے تو سب باتیں سرانجام پا جائینگی۔ خُدا اور غیر خُدا دونوں ہمارے دِلوں پر حکمران نہیں ہو سکتے۔ "کوئی شخص دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا"۔ اِنہی معنوں میں ہمارا خُدا "غیور" خُدا ہے۔ وہ اِس بات کی برداشت نہیں کر سکتا کہ اُس کے سوا کوئی اور شئے بھی ہمارے دِلوں پر حکمران ہو کر اُس کی جگہ غصب کر لے۔ پس کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ "پہلے تم خُدا کی بادشاہت اور اُس کی راستبازی کی تلاش کرو"۔ اگر ہم خُدا پر کامل بھروسا رکھینگے تو وہ ہماری خبرگیری فرمائیگا۔ جس طرح وہ

پرندوں کی خبر گیری کرتا ہے وہ ہمیں بھی پوشاک عطا کریگا کیونکہ وہ پھولوں کو ایسی پوشاک دیتا ہے کہ "سلیمان بھی باوجود اپنی تمام شان و شوکت کے ان میں سے کسی کی مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا" اس لئے تم اپنی جان کا فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائینگے یا کیا پیئینگے نہ اپنے بدن کا کہ کیا پہنینگے" فکر کرنا حماقت ہے فکر کیا کر سکتا ہے ؟ ہم کل کی فکر کو خدا پر جو ہمارا پروردگار اور باپ ہے چھوڑ دیں اور روزانہ ضروریات کے پورا ہونے کے لئے اُس کے شکر گذار ہوں اور اُس کی مرضی کو سب باتوں پر مقدم سمجھ کر اُس پر عمل کریں۔ کیونکہ جو اُس پر عمل نہیں کریگا وہ خدا کی بادشاہت میں ہرگز داخل ہونے نہ پائیگا +

پس خدا کی بادشاہت "غیر مرئی اور نادیدنی قوانین کی دنیا ہے جن کے وسیلے خدا اپنی مخلوقات پر حکومت کرتا ہے اور اُن کو برکت دیتا ہے"[9]

(۱۱)

خدا کی بادشاہت کی عالمگیری :-

خداوند مسیح نے "پہاڑی وعظ" میں اپنی بادشاہت کے قوانین وضع فرمائے جو لازوال اور بے تبدیل ہیں اور کبھی منسوخ نہیں ہو سکتے یہ قوانین یہودی شریعت کی طرح تنگ اور کسی خاص قوم سے مختص نہیں ہیں بلکہ عالمگیر ہیں اور ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانہ کے ہر فرد بشر کے لئے وضع کئے گئے ہیں موسوی شریعت باطل نہ تھی لیکن غیر مکمل ضرور تھی کیونکہ وہ صرف اہلِ یہود کے لئے وضع کی گئی تھی پس اُس کا اطلاق روئے زمین کی اقوام کے افراد پر نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن خدا کی بادشاہت صرف اہلِ یہود کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر "ایک قوم اور قبیلے اور اُمت اور اہلِ زبان کے بے شمار" لوگوں کے لئے ہے (مکاشفہ ۷: ۹)

؎ عام ہے یار کی تجلّی میرؔ
خاص مُوسیٰ و کوہِ طُور نہیں

پس ضروری تھا کہ اِس سلطنت کا سُلطان اُس غیر مکمل شریعت کی تکمیل کرے اور اس کی تنگ حدُود کو اتنا وسیع کر دے کہ وہ کُل بنی نوع اِنسان پر حاوی ہو سکے۔ کلمتہ اللہ نے شریعت کے مختلف حصص میں تمیز کر کے مقدّم حصص کو لازم اور عارضی حصص کو جن کا تعلّق صرف یہُودی قوم سے ہی تھا۔ غیر ضرُوری قرار دے دیا۔ بعض احکام مثلاً "اِنصاف۔ رحم۔ اِیمان" وغیرہ لازمی اور ضروری تھے (متّی ۲۳: ۲۳) لیکن قیوُد شرعیہ کو جو عالمگیریت کے منافی تھیں اور ظاہری رسُوم کو درحقیقت "بھاری بوجھ" تھے (متّی ۲۳: ۴) آپ نے منسُوخ کر دیا۔ (متّی ۲۳: ۱-۴ و ۱۵-۲۳ + ۹: ۱۳ + ۱۲: ۷ وغیرہ) یہ قیوُد موُخر ہیں اور اخلاقی فرائض اور رُوحانی اصُول مقدّم ہیں (مرقس ۷: ۱۵-۲۳ + ۱۲: ۲۳-۳۴ + متّی ۹: ۱۳ وغیرہ)

فریسیوں اور مُعلّمانِ شرع کو ملامت کرنے میں کلمتہ اللہ نے شریعت کی تنگدستی اور تہیدستی کو لوگوں پر ظاہر کر دیا۔ ہم کلمتہ اللہ کی مُشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں کیونکہ جب ہوسیع نبی نے کہا تھا کہ خُدا فرماتا ہے کہ "مَیں قُربانی پسند نہیں کرتا بلکہ رحم چاہتا ہُوں" (۶: ۶) اُس وقت مُوسوی شریعت احاطۂ تحریر میں نہیں آئی تھی۔ اور ہوسیع نبی کو کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا لیکن جب کلمتہ اللہ نے یہ الفاظ اپنی زبانِ مُبارک سے فرمائے اُس وقت مُوسوی شریعت کی کُتب مُعلّموں اور ربّیوں کے ہاتھوں میں موجود تھیں اور ان میں قُربانیوں کا گذراننا اور دیگر قیوُدِ شرعیہ کا ادا کرنا لازم قرار دیا ہُوا تھا لیکن آپ نے قیوُد شرعیہ کی جڑ پر کلہاڑا مارا پس آپ میں اور مُعلّمانِ شرع

ہیں کشمکش شروع ہو گئی۔ موسوی شرع کے اندر مختلف احکام میں تقدیم و تاخیر کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ تمام احکام یکساں طور پر احکامِ الٰہی تھے۔ خواہ وہ اخلاقی اور رُوحانی فرائض ہوں یا قیودِ شرعیہ ہوں اور اُن کی یکساں طور پر بجا آوری ہر یہودی کا فرض خیال کیا جاتا تھا۔ اُن کی نظر میں خدا کو اپنے سارے جی جان، عقل اور زور سے پیار کرنے کا حکم خرگوش کے گوشت کو نہ چکھنے کے حکم کے برابر تھا۔ یہودی ربیّوں کے خواب و خیال میں بھی یہ بات کبھی نہ آتی کہ چونکہ رحم کرنا خرگوش کھانے سے بہتر ہے لہٰذا اگر ہم خرگوش کا گوشت کھائیں تو کچھ مضائقہ نہیں بشرطیکہ ہم رحم کریں۔ کلمۃ اللہ نے جو عہدِ عتیق کے احکام کو ضروری اور عارضی حصّوں میں منقسم کیا وہ یہودی ربیوں اور عالمانِ شرع کی نظر میں کفر ہے کلم نہ تھا۔

مثال کے طور پر ہم حرام اور حلال خوراک کو لیں۔ یہودی ربی کسی اور امر پر اتنا زور نہیں دیتے تھے جتنا وہ اِس سوال پر زور دیتے تھے کیونکہ خوراک کے احکام پر روزمرّہ عمل کرنا ہوتا تھا لیکن حرام و حلال کے اصول حقیقی روحانیت کے خلاف تھے۔ خُدا کی بادشاہت صرف اہلِ یہود پر ہی مشتمل نہ تھی بلکہ وہ رُوئے زمین کے باشندوں کے لئے تھی لہٰذا یہ اُصول عالمگیریت کے خلاف تھے پس کلمۃ اللہ نے حرام حلال کی تمیز کو مٹا دیا اور ان احکام کو ردّ کر دیا (مرقس ۷: ۹ وغیرہ) کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ کسی مادی شے کے کھانے سے رُوح ناپاک نہیں ہو جاتی صرف بُرے خیال اور افعال ہی رُوح کو ناپاک کر سکتے ہیں۔ بیرونی اشیاء انسانی رُوح کو ناپاک نہیں کر سکتیں۔ انسانی رُوح صرف باطنی طور پر ناپاک ہو سکتی ہے اگر کلمۃ اللہ کا یہ قول صحیح ہے تو شرعی قیود غلط ثابت ہوئیں اور اگر شرعی

قیوُد صحیح ہیں تو کلمۃ اللہ کا اصُول غلط ہو گا۔ پس چُونکہ شرعی قیوُد اِس رُوحانی اصُول کے سراسر منافی تھیں اور یہ اصُول حق تھا۔ لہٰذا کلمۃ اللہ نے اِن قیوُد کو رد کر کے خُدا کی بادشاہت کے قانُون کو عالمگیر کر دیا۔

اِسی طرح ابنِ اللہ نے یہُود کا یہ خیال کہ صرف آلِ ابراہیم ہی خُدا کی برگزیدہ قوم ہے جِس کا وہ خالق اور سلطان ہے حقیقی رُوحانیت کے خلاف پایا اور تمام عُمر آپ اِس خیال کے خلاف جہاد کرتے رہے یہُود کا یہ عقیدہ ایک قومی عقیدہ تھا ان کا یہ خیال تھا کہ بنی اسرائیل کا ہر فرد خُدا کی بادشاہت میں شریک ہوگا۔ لیکن خُداوند مسیح نے ان کو خبردار کیا اور فرمایا کہ آلِ ابراہیم سے ہونا خُدا کی بادشاہت کی ٹکٹ نہیں اور نہ یہُودی اِس کے اجارہ دار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اِس بادشاہت میں داخل ہونا ہر شخص کے اعمالِ صالح پر منحصر ہے۔ خواہ وہ آلِ ابراہیم سے ہو یا نہ ہو۔ بلکہ ایسے لوگوں کو جو اپنے نسب پر تکیہ کئے بیٹھے تھے آپ نے فرمایا کہ " میں تُم سے کہتا ہُوں کہ بہتیرے پُورب اور پچھم سے آکر ابراہیم اور اضحاق اور یعقُوب کے ساتھ آسمان کی بادشاہت کی ضیافت میں شریک ہونگے مگر بادشاہت کے بیٹے (اہلِ یہُود) باہر اندھیرے میں ڈالے جائینگے۔" (متی ۸: ۱۱-۱۲) آپ نے یہ تعلیم دی کہ خُدا ہر فردِ بشر کا باپ ہے خواہ اُس کی اصل نسل کچھ ہی ہو۔ وہ راست اور ناراست آدمیوں کا باپ ہے۔ (متی ۵: ۴۵) وہ اپنے فرزندوں کا پروردگار ہے اور چاہتا ہے کہ ہر فرد بشر اُس سے محبت رکھے۔ وہ کسی گنہگار کی موت نہیں چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے باز آئے اور زندہ رہے پس آپ نے خُدا کی بادشاہت کا دروازہ کُل دُنیا کے مومنین کے لئے کھول دیا +

علے ہذالقیاس کلمۃ اللہ نے روزہ، نماز کی قیوُد۔ تعدادِ ازدواج اور طلاق

کی اجازت غسل وطہارت اور ہاتھ دھونے وغیرہ کے احکام کو حقیقی روحانیت اور خدا کی بادشاہت کی عالمگیریت کے خلاف پایا اور اُن کو یکسر رد کر دیا۔ (مرقس ۲: ۲۳-۲۶ + ۲: ۱۸-۲۰ + ۷: ۱-۲۳ + ۷: ۱۹ + ۱۰: ۵-۹ وغیرہ) آپ نے جیسا ذکر کیا گیا ہے۔ شرعی احکام کو لازمی اور غیر ضروری حصوں میں منقسم کر کے ان میں عالمگیریت کی اہلیت پیدا کر دی۔ پس کلمتہ اللہ کی تعلیم "کورے کپڑے کا پیوند" نہیں ہے جو یہودیت کی فرسودہ پرانی پوشاک میں لگایا گیا ہو بلکہ آپ کی تعلیم کے تانے بانے میں یہودی کتب سماوی کے تمام روحانی اصول بُنے گئے ہیں۔ آپ نے لازمی احکام کو اعلیٰ مطمح نظر کے ماتحت کر کے شریعت کو اُس کے اصلی اور اعلیٰ مفہوم کے مطابق کامل کر دیا مثلاً شرعی حکم "تو خون نہ کر" کو یوں کامل کیا کہ اس کے ماخذ ناجائز غصہ کو ممنوع قرار دے دیا (متی ۵: ۲۱-۲۶) علیٰ ہذا القیاس شرعی حکم "تو زنا نہ کر" کو یوں کامل کیا کہ اس کے ماخذ ناجائز خواہش کو ممنوع قرار دے دیا (متی ۵: ۲۵-۲۷) احکام شرعیہ کا معیار جس سے خداوند نے ضروری احکام کو غیر ضروری احکام سے جدا کیا یہ تھا کہ آیا وہ احکام حقیقی روحانیت کا مظہر ہیں یا نہیں (متی ۱۹: ۸ + ۲۳: ۲۳ وغیرہ)

یہودی عالم ڈاکٹر ہاشمی قبودی اپنی تفسیر اناجیل ثلاثہ کی تمہید میں خداوند مسیح اور شریعت کے سوال پر بحث کرتا ہوا کہتا ہے کہ "یسوع نے سبت کے قوانین اور حرام حلال کھانوں وغیرہ پر حملہ کیا اس کی بصیرت اور روحانی روشنی اور خالص مذہبی روح کے سامنے سخت رکاوٹ پیش آئی شریعت کہتی تھی کہ اس کی رسوم ایک کامل خدا کے احکام ہیں اور اُن کی ادائیگی واجبات میں سے ہے پر مسیح اور اُس سے پہلے اُستادوں کے درمیان

متنازعہ فیہ تھا اور کشمکش کا شروع بھی اسی سے ہوا۔ ممکن ہے کہ یہودی ربی مثلاً ہلیل وغیرہ کے خیال میں آیا ہو کہ اخلاقی قوانین حرام حلال کی قیود سے بہتر ہیں۔ لیکن وہ اس مضمون پر کبھی اس طرح آزادانہ بحث نہ کرتے جس طرح یسوع نے کی ہلیل ہمیشہ شریعت کا خادم ہی رہا اور اس کی تنقید کرنے کی جرأت خواب وخیال میں بھی اس کو کبھی نہ ہوئی۔۲۳ لیکن جہاں ہلیل شریعت کا خادم تھا وہاں کلمۃ اللہ شریعت کے مالک تھے آپ نے لازمی احکام کا معیار حقیقی روحانیت مقرر کیا اور جو احکام اس معیار پر پورے نہ اترے وہ غیر ضروری قرار دے دئے گئے۔

پس خدا کی بادشاہت کی عالمگیریت اس سے ثابت ہے کہ اس کے قوانین عالمگیر ہیں ان میں ظاہری رسوم اور قیود شرعیہ کا قطعی نام تک موجود نہیں۔ یہودیت کے اصول ان قیود میں مقید تھے لہٰذا اس میں عالمگیریت کی صلاحیت موجود نہ تھی۔۲۴ لیکن چونکہ کلمۃ اللہ کے اصول تمام روحانی ہیں وہ زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہیں لہٰذا ان کا اطلاق ہر ملک قوم ملت اور طبقہ کے لوگوں پر ہو سکتا ہے۔

(۱۳)

چند اعتراضات کے جواب:۔

بعض اصحاب کہتے ہیں کہ مسیحیت کی عالمگیریت کا ذمہ دار کلمۃ اللہ نہیں بلکہ آپ کا رسول پولوس ہے۔ لیکن مندرجہ بالا امور سے ارباب بینش پر ظاہر ہو گیا ہوگا کہ کلمۃ اللہ نے ایک ایسا طریق جاری کیا جو عالمگیر تھا۔ چنانچہ فاضل یہودی ربی ڈاکٹر کلاسنر KLAUSNER

کہتا ہے کہ "بہت یہودی اور عیسائی یہ خیال کرتے ہیں کہ مسیح کی تعلیم کے عبرانی عناصر کی جگہ پولوس نے مسیحیت میں یونانی عناصر داخل کر دئے تھے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جس قسم کا درخت ہوتا ہے ویسا ہی اُس کو پھل لگتا ہے اگر یسوع کی تعلیم میں ایسے اجزا نہ ہوتے جو یہودیت کے خلاف تھے۔ تو کبھی کوئی ایسی نئی تعلیم پیدا نہ ہوتی جو یہودیت کے اس قدر نقیض ہے۔ نیستی سے کوئی شے ہست نہیں ہو سکتی یسوع کی تعلیم میں یقیناً ایسے عناصر پہلے ہی سے موجود تھے جن کا مابعد کے زمانہ میں بڑھ کر یہودی تعلیم کے نقیض ہونا ایک لازمی امر تھا۔ یہی عالم ایک اور جگہ کہتا ہے کہ "اگر یسوع کی تعلیم میں اس قسم کے اجزا نہ ہوتے تو فریسی ساؤل کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آتی کہ شرعی احکام وغیرہ کو رد کیا جائے اور نہ اس بات کو مسیحیت کا قانون بنانے میں اُس کو کبھی کامیابی حاصل ہوتی۔"

بعض نکتہ چین کہتے ہیں کہ خداوند مسیح صرف ایک یہودی مصلح تھے اور آپ کے خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ آپ ایک عالمگیر بادشاہت کے بانی ہونگے۔ اس ثبوت میں وہ کہتے ہیں کہ جناب مسیح نے سورو فینیکی عورت کو فرمایا تھا کہ "میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں بھیجا گیا"۔ (متی ۱۵: ۲۴) ؏

لیکن ہم سطور بالا میں ذکر کر چکے ہیں کہ بابل کی اسیری کے وقت سے ہی اہل یہود کو اس امر کا احساس ہو گیا تھا کہ اُن کے وجود کا واحد مقصد یہ تھا کہ غیر یہود کو خدا کی نجات کا پیغام سنائیں (یسعیاہ ۴۲: ۶+ ۴۹: ۶+ ۵۶: ۶+ صفنیاہ ۳: ۹+ حبقوق ۲: ۱۴+ زبور ۲۲: ۲۷-۳۱+

؏ اس اعتراض پر ہم نے ایک مستقل رسالہ "اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی؟" لکھا ہے۔ برکت اللہ

۲:۶۵-۶+۲:۸۶-۹+۸۷:۴-۷+میکاہ ۵:۷+ملاکی ۱:۱۱ وغیرہ) خُداوند کے ہم عصر یہود بُت پرستوں اور مُشرکوں میں اپنے دین کی اشاعت کیا کرتے تھے۔(متی ۲۳:۱۵+اعمال ۲:۱۱) کیا کلمتہ اللہ اپنے ہم عصر یہود سے زیادہ تنگ خیال تھے؟ خود خُداوند کا لائحہ عمل اس اعتراض کو رد کر دیتا ہے۔ خُداوند نے "غیر قوموں کی گلیل" کو اپنا وطن بنایا (متی ۴:۱۵) آپ صور و صیدا کی سرحدوں میں گئے (مرقس ۷:۲۴) پھر وہاں سے نکلکر آپ دکپلس کی سرحدوں میں گئے (مرقس ۷:۳۰) اور اُن علاقوں کے بیماروں کو شفا بخشی۔ اسی طرح ادومیہ سے اور یردن کے پار اور صور و صیدا کی آس پاس کی ایک جم غفیر نے خُداوند کی تعلیم سے فیض پایا (مرقس ۳:۸) آپ سامریہ میں گئے (لوقا ۹:۵۲) اور سامریوں کو تعلیم دی (یوحنا ۴:۴+۴:۲۴) آپ نے سامری کوڑھی کو شفا عطا کی (لوقا ۱۷:۱۵) حالانکہ یہودیوں اور سامریوں میں سخت عناد تھا۔ آپ نے رُومی صوبہ دار کے خادم کو شفا عطا کی گو رُومی فاتحین اور یہودی مفتوحین ایک دوسرے سے متنفر تھے۔ آپ نے سُور فینیکی عورت کی بیٹی کو جو یُونانی اور بُت پرست تھی شفا عنایت کی +

جب ہم مُنجی عالمین کے اقوال پر نظر کرتے ہیں۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے صاف فرمایا "بہتیرے پُورب اور پچھم سے آکر ابرہام اور اضحاق اور یعقوب کے ساتھ آسمان کی بادشاہت میں شریک ہونگے لیکن بادشاہت کے بیٹے (یہودی) باہر اندھیرے میں ڈال دئے جائینگے"۔ (متی ۸:۱۱) آپنے حواریوں کو فرمایا کہ وہ اہل یہود اور غیر یہود دونوں میں آپ کے گواہ ہونگے (متی ۱۰:۱۸) خُداوند کی تمثیلیں اس پر شاہد ہیں چنانچہ آپ نے کڑوے دانوں کی تمثیل

کو سمجھا کر فرمایا "اچھے بیج کا بونے والا ابنِ آدم ہے اور کھیت دُنیا ہے" (متی ۱۳: ۳۸) انگوری باغ کی تمثیل میں آپ نے فرمایا کہ خدا کی بادشاہت آلِ ابراہیم سے لے لی جائیگی اور غیر یہود اُس میں داخل ہونگے (متی ۲۱: ۴۳) بکریوں اور بھیڑوں کی تمثیل میں آپ نے فرمایا کہ "جب ابنِ آدم جلال میں آئیگا تو سب اقوام اُس کے حضور حاضر کی جائینگی"۔ (متی ۲۵: ۳۲) خداوند نے شاگردوں کو یہ وصیت فرمائی کہ "تم تمام دُنیا میں جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ"۔ (متی ۲۸: ۱۹)

پس خداوند مسیح کا طرزِ عمل۔ لائحہ عمل اور کلماتِ طیبات سب صاف طور پر ثابت کرتے ہیں کہ کلمۃ اللہ اپنے آپ کو ایک یہودی مصلح ہی نہیں بلکہ منجی عالمین تصوّر فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند نے جو نام اپنے لئے منتخب فرمایا وہ ابنِ داؤد نہیں بلکہ "ابنِ آدم" تھا۔ نہایت دلی آرزو کے ساتھ آپ تمام دُنیا کو دعوت دیتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں۔ "اے محنت اُٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو سب میرے پاس آؤ۔ میں تم کو آرام دُونگا"۔ (متی ۱۱: ۲۸)

ع۔ ہست میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا

معترض پوچھ سکتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے تو خداوند نے کیوں فرمایا کہ "میں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا نے اہلِ یہود کو اس واسطے اقوامِ عالم میں سے چن لیا تا کہ وہ تمام دُنیا میں اس کا عِلم پھیلانے کا وسیلہ ہوں۔ الٰہی انتظام نے مختلف اقوام کو مختلف نعمتیں عطا کی ہیں۔

ع۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند

پر مُہر کرتا ہے (مرقس ۱:۱۱ + ۹:۷ وغیرہ) آپ کا حال یہ تھا کہ

~ صورتش بر خاک و جاں بر لامکاں
لامکانے فوقِ وہمِ سالکاں

(مولانا رُومؒ)

پس مُنجیٔ عالمین کے اقوال وافعال۔ آپ کی نصائح اور طرزِ عمل آپ کی تعلیم کے اصُول اور آپ کا کامل نمونہ تمام اِس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ کی تعلیم عالمگیر ہے۔ اور تاریخ اِس امر کی گواہ ہے کہ آپ کی تعلیم ہر مُلک اور قوم اور طبقہ میں اور ہر آب وہوا اور فضا میں پھلتی پھُولتی رہتی ہے۔ مسیحیت کی تعلیم ہر زمانہ اور ہر مُلک اور ہر قوم کے ہر فرد کے ساتھ سازگاری کر سکی جہاں جہاں کلمۃ اللہ کی تعلیم گئی اُس نے ہر دفعہ اور ہر ماحول اور ہر زمانہ میں کامیابی کے ساتھ رائج ہونے کی قابلیت کا ثبُوت دیا اس کے قانونِ کلّی تمام ممالک اور ازمنہ کے اصُول وکلیاتِ تمدّن معاشرت اقتصاد اور ارتقائے ذہنی و رُوحانی کا جامع ہو کر بہ آسانی تمام جُزئیات کا اِستخراج کر سکنے کی اِستعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اِس کی مکمل وجامع تعلیم تمام ممالک کے ہر شعبۂ زندگی پر حاوی ہونے کی مُدعی رہی ہے اور نظامِ عالم کی شیرازہ بندی کرتی آئی ہے +

باب چہارم

کلمۃ اللہ کی ذات کے بارے میں اناجیل کی تعلیم

کلمۃ اللہ نے اپنی خدمت کی ابتدا میں ناصرت کے عبادت خانہ میں یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں سے ایک مقام پڑھ کر فرمایا کہ "آج یہ نوشتہ تمہارے سامنے پورا ہوا ہے"۔ (لوقا ۴: ۲۱) وہ مقام یہ تھا "خداوند کا روح مجھ پر ہے اس لئے کہ اس نے مجھے غریبوں کو خوشخبری دینے کے لئے مسح کیا۔ اس نے مجھے بھیجا ہے کہ قیدیوں کو رہائی اور اندھوں کو بینائی پانے کی خبر سناؤں۔ کچلے ہوؤں کو آزاد کروں اور خداوند کے سال مقبول کی منادی کروں"۔ (لوقا ۴: ۱۸-۱۹) آپ نے ان آیات کا اقتباس کرتے وقت الفاظ "ہمارے خدا کے روزِ انتقام کا اشتہار دوں" کو جو صحیفے میں لکھے

تھے نہ پڑھا بلکہ اُنکو دیدہ و دانستہ چھوڑ دیا اور یُوں بنی اسرائیل کو اپنی رسالت کے مقصد سے آگاہ فرمایا۔ ایک ابتدائی مسیحی اِس مطلب خیز فروگذاشت کو ذیل کے الفاظ میں بیان کرتا ہے "کیا خُداوند مسیح دُنیا میں حکومت کرنے اور لوگوں کے دلوں میں خوف اور دہشت اور ہئیت بٹھانے کے لئے بھیجا گیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ خُدا نے اُس کو نرمی اور انکساری سے بھیجا تاکہ وہ دُنیا کو محبّت کے ذریعہ نجات دے اور گنہ گاروں کے دلوں کو خدا کی جانب راغب کرے نہ کہ وہ تشدّد سے کام لے۔ کیونکہ تشدّد کا خُدا کے ساتھ کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں ہے"۔

خُداوند کا مختلف اوقات پر صحف انبیاء کے مقامات کا اپنی ذات پر اطلاق کرنا (لوقا ۴: ۲۱ + ۲۲: ۳۷ وغیرہ) اِس امر کو صاف ظاہر کرتا ہے کہ آپ کا خیال تھا کہ آپ پر وہ پیشین گوئیاں صادق آتی ہیں جو عہد عتیق کی کُتب مقدسہ میں موجود ہیں۔ اور کہ آپ دُنیائے مذہب میں ایک نیا دَور شروع کرنے آئے تھے۔ آپ کے خیال مبارک میں اِس نئے دَور کا انحصار اُس بے نظیر اور لاثانی رشتہ پر ہے جو آسمانی باپ اور اکلوتے بیٹے میں تھا اِس رشتہ کو ظاہر کرنے کے لئے آپ نے اپنے لئے چند خطابات تجویز فرمائے اگر ہم اِن خطابات پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالیں تو اِس رشتہ کی حقیقت اور اہمیت ہم پر ظاہر ہو جائیگی۔

(۱)

ابن اللہ:-

عہدِ عتیق کی کُتب میں یہ خطاب مختلف اوقات پر مختلف برگزیدہ ہستیوں

کے لیئے استعمال ہُوا ہے۔ مثلاً فرشتوں کے لیئے (ایوب ۳۸: ۷)۔ یہودی قوم کے لیئے (ہوسیع ۸ : ۱ + خروج ۴ : ۲۳) قاضیوں کے لیئے (زبور $\frac{82}{6}$) شاہانِ اسرائیل کے لیئے (زبور ۸۹ : ۲۲۶ + ۲ سموئیل ۷ : ۱۴) اور مسیح موعود کے لیئے (زبور ۲ و ۸۹) پس یہ خطاب اُن لوگوں کے لیئے استعمال ہُوا تھا۔ جو خُدا کے خاص برگزیدے اور اُس کی رضا کو پُورا کرنے والے تھے۔ کلمتہ اللہ کے زمانہ میں اِس خطاب سے اہلِ یہود بخُوبی واقف تھے۔

اناجیل ثلاثہ میں "ابن اللہ" کا خطاب تقریباً ۲۷ جگہ خُداوند کے لیئے استعمال کیا گیا ہے گو کلمتہ اللہ نے خُود اپنی زبانِ مُبارک سے اِس خطاب کو اپنے لیئے استعمال نہیں فرمایا لیکن انجیل اوّل میں چھ مقامات میں انجیل دوم میں ایک مقام میں اور انجیل سوم میں تین مقامات میں مُنجیٔ کونین نے اپنے لیئے خاص معنوں میں لفظ "ابن" یا "بیٹا" استعمال فرمایا جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو ابن اللہ تصور کرتے تھے اور انجیل اوّل میں قریباً بیس دفعہ انجیل دوم میں دو دفعہ اور انجیل سوم میں نو دفعہ آپ نے اپنی زبانِ حقیقت ترجمان سے خُدا کو خاص معنوں میں "اپنا باپ" کہا (متی ۷ : ۲۱ + ۱۰ : ۳۲ + ۱۱ : ۲۷ + ۱۵ : ۱۳ وغیرہ وغیرہ) قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اناجیل میں جب دیگر اشخاص مُنجیٔ عالمین کو "خُدا کا بیٹا" کہتے تھے۔ (مثلاً متی ۲۶ : ۶۳ وغیرہ) تو اِس خطاب سے انکا مطلب صرف "مسیح موعُود" تھا لیکن اگر ہم اُن مقامات کو غور سے پڑھیں جہاں ہمارے مُبارک خُداوند نے اپنے آپکو "بیٹا" یا خُدا کو اپنا خاص "باپ" کہا ہے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس خطاب سے خُداوند کا مطلب "مسیح موعُود" نہیں ہے مثلاً ذیل کا مقام ملاحظہ ہو۔ "میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں

جاننا سوا بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اُسے ظاہر کرنا چاہے" (متی ۱۱: ۲۶-۲۷)
ایک سطحی نظر ہم پر یہ ظاہر کر دیتی ہے کہ یہاں "باپ" اور "بیٹے" کا تعلق ایک لاثانی
اور بےنظیر تعلق ہے جس کا "مسیح موعود" کے تصور کے ساتھ کچھ واسطہ نہیں یہ رشتہ
جس کا ابن اللہ کو احساس ہے ایک بے عدیل رشتہ ہے۔ اور جس طرح آپ
کو اس رشتہ کا احساس ہے اُسی طرح آپ کو اُس الٰہی مقصد کا بھی احساس
ہے جس کو پورا کرنے کے لئے آپ اس دُنیا میں بھیجے گئے آسمانی باپ کا
منشا یہ تھا کہ بنی آدم کو آسمان کی بادشاہت عطا کرے (لوقا ۱۲: ۳۲)
لیکن یہ بخشش ابن اللہ کے وسیلے حاصل ہوتی ہے جس نے خُدا کی محبت اور ابوت
کو دُنیا پر ظاہر کیا ہے اور جس نے اپنی جان خوشی سے دے دی تاکہ خُدا کی
بادشاہت زمین پر قائم ہو منجی جہان نے اس مشن اور مقصد کی وجہ سے مسیح
موعود کا تصور اختیار کیا اور یہ تصور ابنیت کے بے عدیل رشتہ پر منحصر
ہے پس خُداوند کی نگاہ میں ابنیت کا رشتہ مقدم اور مسیح موعود کا تصور موخر
تھا۔ آپ کے بپتسمہ کے وقت اور آپ کی مبارک صورت کے بدلنے کے
وقت جو الٰہی آواز سنائی دی اُس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے اپنی زندگی کی
تقدیس رضائے الٰہی کے مطابق کی ہے۔ (متی ۳: ۱۷ + ۱۷: ۵) لیکن
ابنیت کے احساس کی ابتدا بپتسمہ کے وقت سے نہیں ورنہ "ابن" اور
"مسیح" کے تصورات درحقیقت دو نہیں بلکہ ایک ہی ہونگے۔ مُقدس لوقا ہم
کو بتاتا ہے کہ جب خُداوند کی عمر بارہ برس کی تھی تو آپ کو اپنی ابنیت کا
احساس تھا۔ چنانچہ آپ نے اُم المومنین مریم صدیقہ کو مخاطب کر کے فرمایا
"مجھے اپنے باپ کے کام میں مشغول ہونا ضرور ہے" (۲: ۴۹) پس ابنیت
کا رشتہ اور تصور مقدم اور مسیح موعود کا تصور مؤخر ہے۔ درحقیقت مسیح موعود کا

تصور آپ کی ابنیت پر مبنی ہے۔ آپ مسیح موعود ہونے کی وجہ سے ابن اللہ نہ تھے بلکہ آپ ابن اللہ ہونے کی وجہ سے مسیح موعود اور آسمانی بادشاہت کے سلطان تھے۔ جرمن نقاد ہارنیک کہتا ہے کہ "یہ ظاہر ہے کہ خداوندی ابنیت کا احساس آپ کے مسیح موعود ہونے کے احساس سے مقدم ہے۔ آپ کو ضرور اس امر کا پہلے احساس ہوا ہوگا کہ آپ کون ہیں اور جب آپکو ابنیت کا احساس بطرزِ احسن ہو گیا۔ تب آپ کے خیال میں مسیح موعود کا تصور آیا۔" آپ کی زندگی کا مرکزی تصور وہ بے مثال رشتہ ہے جو آپ کو آسمانی باپ کے ساتھ تھا اور جس کو ادا کرنے کے لیے انجیل چہارم نے خطاب "ابنِ وحید" یا "اکلوتا بیٹا" تجویز کیا ہے۔ ہم منجیٔ عالمین کی تعلیم کو کماحقہ سمجھ نہیں سکتے جب تک ہم اس امر کو مدنظر نہ رکھیں +

ابنیت کے رشتہ کی وجہ سے اور ذاتِ الٰہی کی حقیقی معرفت رکھنے کی وجہ سے ابن اللہ نے مسیح موعود کے تصور کو کلیتہً بدل دیا۔ مسیح موعود کے تصور کے ساتھ سیاسی، اور فوق البشری تصورات وابستہ تھے۔ ابن اللہ نے ان تمام تصورات کو اپنی ابنیت اور خدا کی ابوت کے تصورات کی روشنی میں بدل دیا۔ اور مسیح موعود کا وہ تصور قائم کیا جو آپ کے ہم عصروں کی سمجھ میں نہ آیا +

ابنیت کا یہ رشتہ ایک بے مثال۔ لاثانی اور بے نظیر رشتہ ہے خداوند اُن عام معنوں میں ابن اللہ نہیں جن معنوں میں بنی نوع انسان خدا کے بیٹے ہیں۔ انجیل جلیل میں الفاظ "خدا کے بیٹے" مستعمل ہوئے ہیں مثلاً صلح کرانے والے "خدا کے بیٹے کہلائینگے"۔ (متی ۵: ۹) عامتہ الناس میں سے دشمنوں کے ساتھ محبت کرنے والے خدا کے "بیٹے" ٹھہرینگے (متی ۵: ۴۵)

پس ظاہر ہے کہ خدا کے بیٹے وہ ہیں جو الٰہی رضا کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالتے ہیں اور اپنے خیالات جذبات وغیرہ میں خدا کی مانند ہوتے جاتے ہیں۔ (متی ۵: ۴۸)

لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ جہاں اناجیل کی تعلیم کے مطابق عامۃ الناس[۳۳] "خدا کے بیٹے" ہو جاتے ہیں۔ وہاں خداوند مسیح کی بابت اناجیل میں اس قسم کے الفاظ نہیں ملتے۔ بلکہ آپ کی بابت ہم کو یہ تعلیم ملتی ہے کہ آپ ابن اللہ ہیں۔ ابنیت کا یہ رشتہ اُن معنوں میں نہیں جن معنوں میں بنی نوع انسان خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ رشتہ خاص طور سے صرف آپ کی ذات سے تعلق رکھتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ منجی جہان اس خطاب کو اپنی ذات خاص کے لئے استعمال فرماتے ہیں۔ انجیل چہارم میں تو یہ بات واضح کر دی گئی ہے (۱۳:۳ و ۳۱ و ۳۲ + ۱۶:۲۷-۲۸ + ۴:۳۴ + ۳:۳۵ + ۵:۲۳ و ۲۶ + ۷:۲۹ + ۸:۱۹ و ۵۸ + ۱۰:۱۵ و ۳۰ و ۳۸ + ۱۱:۴ و ۲۵ + ۱۲:۴۵ + ۱۴:۶- ۱۴ + ۱۷:۵ و ۲۱ وغیرہ) لیکن اناجیل ثلاثہ میں بھی یہ امر صاف ظاہر ہے مثلاً (متی ۱۱:۲۷ + ۱۹:۲۸ + ۲۸:۱۹ + مرقس ۸:۳۸ + ۱۲:۶ + ۱۳:۳۲ + ۱۴:۳۶ + لوقا ۲۲:۴۳ و ۴۶ وغیرہ) مشہور نقاد ڈیلمین (Dalman) کہتا ہے کہ " اناجیل ثلاثہ میں کہیں بھی خداوند اپنے لئے خطاب "ابن" کا ایسے طور پر استعمال نہیں کرتے جس سے یہ خیال بھی پیدا ہو سکے کہ یہ خطاب خدا کے ساتھ محض ایک اخلاقی اور مذہبی رشتہ کو ظاہر کرتا ہے۔ یا کوئی ایسا تعلق ظاہر کرتا ہے جو دوسروں کو بھی حاصل ہے یا دوسرے بھی حاصل کر سکتے ہیں[۳۴]۔ یہ خطاب کسی تصور کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ایک صریح حقیقت کا انکشاف کرتا ہے[۳۵]

؎ نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم چہ عالی نسبی

ڈاکٹر میکن ٹوش (Dr. MackinTosh) متی ۱۱: ۲۷ کی تفسیر میں کہتا ہے کہ "خداوند کا اور باپ کا باہمی رشتہ ایسا ہے جس میں کسی اور کا حصّہ نہیں کیونکہ بنی نوع انسان میں سے جو اُس کے وسیلے خدا کے بیٹے بن گئے ہیں کوئی شخص بھی ابنیّت کا وہ رشتہ حاصل نہیں کر سکتا جو اُس کو حاصل ہے۔ خدا اور اُس کے بیٹے کا رشتہ انسانی عقل سے بلند و بالا ہے اور اس رشتہ میں باپ اور بیٹے کی کامل رفاقت ہے یہ محض ایک نیا تصور ہی نہیں بلکہ یہ نیا تصور ایک نئی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے"۔ اسی طرح ڈاکٹر سینڈے (Sanday) کہتا ہے کہ "اگر ہم اصولِ درایت و علم کے مطابق اناجیل کا مطالعہ کریں تو یہ امر بدیہی طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ خداوند کی اپنی نظر میں ابنیّت کے احساس کا مطلب ایسا گہرا صاف اور کامل تھا جو کسی اور شخص کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا"۔ ہم نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ "ابوّت الٰہی کا مفہوم" لکھا ہے اور ناظرین کی توجہ اس کی طرف مبذول کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۳)

عبدِ یہوواہ :- یعنی خداوند کا خادم :-

منجیٔ عالمین کی آمد کے وقت اہلِ یہود کے قومی حالات بہت کچھ اُس زمانے جیسے تھے جس میں یسعیاہ کی کتاب کا دوسرا حصّہ (ابواب ۴۰ تا آخر) لکھا گیا تھا اور عبدِ یہوواہ کا تصوّر صورت اختیار کر رہا تھا (یسعیاہ ۴۱: ۸-۲۰+۲۴:

+ ۱۲:۵۳ تا ۱۳:۵۲ + ۱۰-۴:۵۰ + ۹-۱:۴۹ + ۱۰-۵:۴۳ + ۳ + ۱۸ و ۷-۱
۶۱: ۱-۳ وغیرہ) قوم یہود مشرکین کی غلام تھی اور اسرائیل کی راستبازی اور نجات کے سیاسی اور مذہبی سوالات لوگوں کے اذہان میں پھر جواب کے خواہاں تھے یروشلم کی ہیکل میں اور ارضِ مقدس کے دُور اُفتادہ گوشوں میں شریعت اور صحفِ انبیاء کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ چاروں طرف لوگ مسیح موعود کے منتظر تھے۔ (لوقا ۳: ۱۵) اور شمعون جیسے "اسرائیل کی تسلّی کے منتظر" تھے (لوقا ۲: ۲۵) یہ "تسلّی" وہی تھی جس کا ذکر یسعیاہ کی کتاب کے دوسرے حصّہ کی ابتدا میں ملتا ہے۔ "خداوند فرماتا ہے تم میرے لوگوں کو تسلّی دو۔ تسلّی دو۔ اُسے پکار کے کہو کہ اُس کی مصیبت کے دن گذر گئے" (۴۰: ۱-۲) پس جب خداوند اس دُنیا میں مبعوث ہو کر آئے لوگوں کے ذہن اسرائیل کی رہائی اور نجات کے خیالات کی طرف متوجّہ تھے۔ اور وہ ایک "عبدِ یہوواہ" کی اِنتظار میں تھے جس کی پیش خبری مذکورہ بالا کتاب میں موجود تھی۔

منجئِ کونین نے اپنے آپ کو عبدِ یہوواہ کے تصوّر کا مصداق قرار دیا۔ آپ نے اپنی خدمت کی ابتدا میں عبادت خانہ میں عبدِ یہوّاہ کے ایک مقام کا اقتباس کیا۔ (لوقا ۴: ۱۸-۱۹) اور اپنی زبانِ حقائق ترجمان سے فرمایا "آج یہ نوشتہ تمہارے سامنے پورا ہوا ہے" (لوقا ۴: ۲۳) بپتسمہ کیوقت جو الٰہی آواز آپکو سُنائی دی وہ اسی تصوّر کی صدائے بازگشت تھی (یسعیاہ ۴۲: ۱ + متی ۳: ۱۷) منجئِ جہان نے اپنے آخری ایام میں خدمت کے کام پر زور دیا اور عملی نمونہ دے کر (یوحنّا ۱۳: ۱-۶) آپ نے فرمایا "ابنِ آدم اس لئے آیا ہے کہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیے میں دے" (متی ۲۰... مقابلہ کرو یسعیاہ ۵۲: ۱۳ تا ۵۳: ۱۲) اپنی زندگی کی آخری رات خداوند نے

بعد دولتمندوں کے ساتھ ہؤا کیونکہ اُس نے کسی طرح کا ظلم نہ کیا اور اُس کے مُنہ میں ہرگز چھل نہ تھا" (یسعیاہ ۵۳: ۴-۹)

کلمتہ اللہ کی زبان معجز بیان نے فرمایا تھا کہ "ابنِ آدم اِسلئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتوں کے بدلے فدیہ میں دے" (متّی ۲۰: ۲۸) خُداوند کا مطلب یہ ہے کہ خُدا کی بادشاہت میں صرف خدمت ہی حقیقی عظمت کا معیار ہے۔ یہ معیار آپ نے عبدِ یہوواہ کے تصوّر سے اخذ کیا تھا۔ آپ نے اِس معیار کا اِطلاق نہ صرف بادشاہت کے ممبروں پر کیا بلکہ اپنے اُوپر بھی کیا کیونکہ آپ خود عبدِ یہوواہ تھے۔ اور اس بادشاہت کو قائم کرنے آئے تھے۔ آپ کے خیال میں آپ کی خدمت کا معراج آپ کی صلیبی موت تھی جو اقوامِ عالم کو خُدا کی بادشاہت میں داخل کرنے کا وسیلہ ہوگی۔ یہ خیالات خُداوند نے درحقیقت یسعیاہ نبی کے صحیفہ سے عبدِ یہوواہ کے تصوّر سے اخذ کئے تھے۔ آپ کے خیال میں آپ کی مبارک موت الٰہی منشا کی تکمیل تھی۔ اور یہی تعلیم آپ نے حواریوں کو دی اور فرمایا کہ "جب تک گیہوں کا دانہ زمین میں گر کے مر نہیں جاتا اکیلا رہتا ہے لیکن جب مرجاتا ہے تو بہت سا پھل لاتا ہے۔ جو اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے وہ اُسے کھو دیتا ہے اور جو دُنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے وہ اُسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھیگا" (یوحنّا ۱۲: ۲۴-۲۵)

صلیب کی روشنی نے دُنیا کے تاریک پہلو کو منوّر کرکے دُکھ اور مُصیبت کے مسئلہ لاینحل کو حل کر دیا ہے کلمتہ اللہ نے عبدِ یہوواہ کے تصوّر پر غور کرکے ہم کو یہ سکھایا ہے کہ دُکھ اور رنج موجبِ عذاب نہیں۔ نہ تو دُکھ اور مُصیبت ہمارے گُناہوں کا نتیجہ ہے اور نہ وہ قہرِ الٰہی کا نشان ہے۔

بلکہ رنج اور مصیبت اِس لئے ہیں تاکہ اُن کے ذریعہ "خُدا کے کام ظاہر ہوں۔ (یُوحنّا ۹ : ۲-۳) پس مُصیبت جو ہم پر آتی ہے موجب عذاب نہیں بلکہ موجبِ ثواب ہے۔ آپ نے یہ تعلیم دی کہ رنج اور غم میں ہی حقیقی خوش حالی اور راحت پنہاں ہے۔ زندگی کا راز موت میں پنہاں ہے۔ (یُوحنّا ۱۲ : ۲۴-۲۵)

؎ کسے بہ زُمرۂ اربابِ دِل ندارد راہ
کہ تحفۂ زنسیمِ بلائے آرد

کلمۃ اللہ جو "جلال کا بادشاہ" تھا۔ وہ "مردِ غم ناک اور رنج سے آشنا" بھی تھا۔ اس کی دُنیاوی زندگی کا خاتمہ صلیب پر ہُوا اور اس صلیبی موت میں سے ہمیشہ کی زندگی کے چشمے جاری ہو گئے (یُوحنّا ۴ : ۱۴) کلمۃ اللہ کے سوا کسی پیشوائے دین یا فلاسفر نے دُکھ اور رنج کے مسئلہ کو حل نہ کیا۔ ڈین انگ (Dean Inge) کہتا ہے کہ "بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یُونانی فلاسفہ دُکھ کے مسئلہ کو چھونے سے ڈرتے ہیں۔ درحقیقت مسیحیت کے سوا کسی فلسفہ یا مذہب نے غم کے ڈنک کو نہیں نکالا" ہے۔

اہلِ یہود نے یسعیاہ نبی کے صحیفہ اور خروج ۳۲ : ۳۲ کو اپنی پُر مصیبت تاریخ کی روشنی میں پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا تھا کہ خُدا اُن شہیدوں کی شفاعت منظور کرتا ہے جنہوں نے اُس کی خاطر اپنی جان قربان کر دی تھی ارامی تارگم یسعیاہ نبی کے مذکورہ بالا الفاظ کا اطلاق مسیح موعُود پر کر کے یُوں حاشیہ آرائی کرتا ہے "دیکھو میرا خادم مسیح خوشحال ہو گا وہ ہمارے گناہوں کے لئے دُعا کریگا اور اُس کی خاطر ہماری بدکرداریاں مُعاف کی جائینگی۔ ہم سب بھیڑوں کی طرح تِتّر بِتّر ہو گئے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک

اپنی راہ سے بھٹک گیا تھا۔ لیکن خُداوند کی یہ مرضی ہوئی کہ وہ ہم سبھوں کے گناہ اس کی خاطر معاف کرے۔ اُس نے دُعا کی اور وہ قبول ہوگئی۔ اُس کے لب کھلنے سے پہلے ہی وہ مقبول ہو گیا۔ وہ بہتوں کے گناہوں کے لئے شفاعت کرے گا۔ اور باغی اُس کی خاطر معاف کئے جائیں گے۔" یہ الفاظ عید فسح کے موقعہ پر یہودی عبادت خانوں میں پڑھے جاتے تھے۔ منجئ عالمین نے ان کو بہتیری دفعہ سنا تھا اور یہ الفاظ اپنے اوپر چسپاں کئے تھے یہی وجہ ہے کہ منجئ جہان نے آخری فسح پر عشائے ربانی کی رسم مقرر کرتے وقت فرمایا "یہ نئے عہد کا میرا وہ خون ہے جو بہتیروں کے لئے گناہوں کی معافی کے واسطے بہایا جاتا ہے" جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید الشہدا خُداوند یسوع کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے پیروؤں کی شفاعت کرے گا۔ پس ظاہر ہے کہ خود خُداوند مسیح نے عبد یہوواہ کے تصوّر پر غور کر کے اس تصوّر کا اطلاق اپنی زندگی اور موت پر کیا تھا۔ منجئ کونین اپنے آپ کو عبدِ یہوواہ خیال کرتے تھے۔

یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے مطابق عبدِ یہوواہ کے ذریعہ اقوام عالم خُدا کی طرف رجوع کریں گی "وہ اقوام عالم کے درمیان عدالت و انصاف کا اعلان کرے گا۔ میں خُداوند نے تجھے صداقت کے لئے بلایا اور لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لئے تجھے دوں گا" (یسعیاہ ۴۲: ۱-۶) اسی تصوّر کی روشنی میں کلمۃ اللہ نے اپنی موت کو خوشی سے قبول کیا۔

کیونکہ ابن اللہ خُدا کی طرف سے ایک بخشش تھے جو بنی نوع انسان کو عطا کئے گئے تھے۔ آپ کی موت ایک قربانی تھی۔ جو اقوامِ عالم کے گنہگاروں کو خُدا کے پاس لانے کا ذریعہ تھی۔ (یوحنا ۱: ۲۹ و ۳۵ و ۳: ۱۶) آپ نے فرمایا کہ آپ کی زندگی اور موت کا مقصد ہی یہ ہے

کہ اقوام عالم خدا کی طرف رجوع کریں۔ آپ کی زبانِ فیض ترجمان نے فرمایا "ابنِ آدم اِس لیے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتوں کے بدلے فدیہ میں دے"۔ (متی ۲۰: ۲۸) جب موت نزدیک آئی تو آپ نے فرمایا "مَیں اسی سبب سے تو اِس گھڑی کو پہنچا ہُوں۔ اے باپ اپنے نام کو جلال دے"۔ (یُوحنا ۱۲: ۲۷-۲۸) آپ کا یہ پختہ یقین تھا کہ آپ کے دُکھ اور تکلیف اور آپ کی موت کی وجہ سے اقوام عالم زندگی حاصل کرینگی۔

(۳)

ابنِ آدم :-

عبدِ یہوواہ کے تصوّر کے ساتھ ابنِ آدم کا خطاب بھی وابستہ ہے یہ خطاب دانی ایل کی کتاب ۷: ۱۳ میں اور حنوک کی کتاب (ابواب ۳۷ تا ۷۰) میں ملتا ہے۔ حنوک کی کتاب کے یہ ابواب مُنجی عالمین کی بعثت سے ایک صدی پہلے (غالباً ۹۶ سنہ ق م تا ۶۴ سنہ ق م) لکھے گئے تھے۔ ان میں "ابنِ آدم" ایک فوق البشر ہستی ہے جو قادرِ مُطلق کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہے اور عدالت کرتا ہے۔ ہمیں واثق یقین ہے کہ کلمۃ اللہ اِن تمام تصوّرات سے بخُوبی واقف تھے اور آپ نے "ابنِ آدم" کا تصوّر ان کُتب سے اور آٹھویں زبُور سے اور حزقی ایل (۲: ۱) سے اخذ کیا تھا۔

یہ خطاب اناجیل ثلاثہ میں ۶۹ دفعہ استعمال ہُوا ہے۔ انجیل اوّل میں تیس دفعہ۔ انجیل دوم میں ۱۴ مرتبہ اور انجیل سوم میں ۲۵ دفعہ استعمال ہُوا ہے۔ یہ خطاب اناجیل کے اُن تمام حِصص میں موجُود ہے۔ جن سے اناجیل مرتب

ہیں۔ اور جن کا ذکر اِس رسالہ کے مقدمہ میں کیا گیا تھا اور جن کو ہم نے کے سے موسوم کیا تھا۔ ربنا المسیح نے چالیس مختلف اوقات پر یہ خطاب اپنے لئے اِستعمال فرمایا۔ ہم کو یہ ایک انوکھی بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ کوئی شخص اپنے لئے واحد متکلم کی بجائے واحد غائب کا صیغہ ایک خطاب کے طور پر اِستعمال کرے۔ لیکن خداوند نے اِس خطاب کو اپنی ذاتِ خاص کے لئے تجویز فرمایا اور اناجیل میں سوائے کلمتہ اللہ کے کوئی دوسرا شخص اِس خطاب کو آپ کے لئے اِستعمال نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ مُقدس پولُوس رسُول بھی اِس خطاب کو کبھی اِستعمال نہیں کرتا اور اناجیل اربعہ کے علاوہ عہدِ جدید میں سوائے ایک جگہ کے (اعمال ۷: ۵۶) اِس خطاب کا ذکر نہیں ملتا۔

بعض علماء کا خیال ہے۔ کہ یہ خطاب کلمتہ اللہ نے پہلی دفعہ قیصریہ فلپی میں اِستعمال کیا تھا۔ جب آپ نے شاگردوں سے اِستفسار فرمایا تھا کہ لوگ ابنِ آدم کو کیا کہتے ہیں"؟ (متی ۱۶: ۱۳) کیونکہ اِس خطاب سے مراد مسیح موعود تھا اور آپ نہیں چاہتے تھے کہ اِس موقع سے پہلے کسی کو معلوم ہو کہ آپ مسیح موعود ہیں۔ بلکہ اِس موقعہ پر بھی آپ نے "شاگردوں کو تاکید کر کے حکم دیا کہ کسی کو نہ بتانا کہ یہ مسیح ہے" (متی ۱۶: ۲۰ + لوقا ۹: ۲۱) پس یہ علماء کہتے ہیں کہ وہ تمام مقامات جن میں اِس واقعہ سے پہلے "ابنِ آدم" کا ذکر ہے۔ یا تو درحقیقت اِس واقعہ کے بعد وقوع پذیر ہوئے اور یا اُن میں سے بعض ایسے ہیں جن میں "ابنِ آدم" سے مراد درحقیقت بنی آدم یا اِنسان ہے لیکن مرحوم کینن ڈرائیور Canon Driver نے اِس اعتراض کا پول کھول دیا ہے اور بالعموم علماء اُن کے ساتھ متفق ہیں کہ اگر خداوند نے اِس موقعہ پر پہلی دفعہ یہ خطاب اِستعمال فرمایا تو شاگردوں نے کوئی حیرت یا اِستعجاب کیوں نہ ظاہر

کیا؟ خود کلمۃ اللہ کا سوال اِس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اُنہوں نے اس خطاب کو آپ کی زبان مبارک سے کئی دفعہ اِس موقعہ سے پہلے سُنا تھا۔ اور وہ اِس سے واقف تھے۔ کیونکہ اُنہوں نے خداوند سے یہ نہیں پوچھا کہ "ابنِ آدم" جس کی نسبت آپ پوچھتے ہیں کون ہے؟ بالفرض اگر خداوند کے سوال میں یہ خطاب موجود نہ تھا (مرقس ۸: ۲۷ + لوقا ۹: ۱۸) تاہم خداوند نے اِس سوال کے بعد ہی یہ خطاب اپنے لئے اِستعمال فرمایا۔ (مرقس ۸: ۳۱ + لوقا ۹: ۲۲) یہ دلیل اِس بات کو صاف ظاہر کرتی ہے کہ خداوند نے اِس واقعہ سے پہلے کئی دفعہ یہ خطاب علے الاعلان اپنے لئے اِستعمال فرمایا تھا اور اگر یہ صحیح ہے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عوام الناس کے اذہان میں اِس خطاب کا تعلق مسیح موعود کے تصور کے ساتھ وابستہ نہ تھا۔[۱] (یوحنا ۱۲: ۳۴) کیونکہ خداوند نہیں چاہتے تھے کہ ہنوز یہ حقیقت لوگوں پر ظاہر ہو کہ آپ مسیح موعود ہیں۔

لفظ " ابنِ آدم" ارامی زبان میں نوعِ "انسان" کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اِستعمال کیا جاتا تھا۔ ارامی زبان میں یہ کوئی خطاب نہ تھا۔ لیکن کلمۃ اللہ نے اِس ایک معمولی لفظ کو لے کر اس کو اپنی ذات خاص کے لئے تجویز فرمایا۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ آپ کے ذہنِ مبارک میں اِس لفظ کے ساتھ چند ایسی صفات وابستہ تھیں۔ جو آپ کی ذات والا صفات میں بدرجہ احسن پائی جاتی تھیں اور جن کا تعلق آپ کے اُس مشن کے تھا۔ جس کے لئے خدا نے آپ کو اِس دُنیا میں بھیجا تھا۔ آپ اِس جہان میں دُکھ تکلیف اذیت بلکہ صلیب اُٹھانے آئے تھے۔ پس جونہی حواریوں نے کلمۃ اللہ کی مسیحائی کا اِقرار کیا وہ اُنہیں تعلیم دینے لگا۔ کہ ضرور ہے کہ ابنِ آدم بہت دُکھ اُٹھائے اور سردار کاہن اور فقیہ اُسے رد کریں اور وہ قتل کیا جائے

(مرقس ۸ : ۳۱) پس کلمۃ اللہ نے "ابنِ آدم" کے تصوّر کے ساتھ "عبدِ یہوواہ" کا تصوّر وابستہ کر کے دونوں تصوّرات کا اطلاق اپنی مبارک ذات پر کیا آپ نے "ابنِ آدم" کے خطاب کو اسی واسطے پسند فرمایا کیونکہ اس خطاب میں تکلیف اور جلال، مصیبت اور فتح کے تصوّر بآسانی شامل کئے جا سکتے تھے۔
اہلِ یہود کی کُتب کے مطابق "ابنِ آدم" ایک فوق البشر اِنسان تھا۔ جو قادرِ مطلق کے ساتھ جلال کے تخت پر بیٹھ کر عدالت کریگا لیکن دانی ایل کی کتاب کے مُصنّف نے یہ کہیں نہیں کہا تھا کہ اس پُرجلال آمد سے پہلے "ابنِ آدم" دُکھ اور تکلیف نہیں اُٹھائیگا۔ پس کلمۃ اللہ نے اِس خطاب کے ساتھ دُکھ اور مُصیبت اور تکلیف کی برداشت متعلّق کر دی اور اِس کا اِطلاق اپنی ذات پر کیا۔ اب یہ معلوم ہو گیا کہ آپ کا خیال تھا کہ آپ خُود وہ "ابنِ آدم" ہیں جس کا ذکر دانی ایل کی کتاب میں مِلتا ہے لیکن آپکا یہ بھی خیال تھا کہ اس سے پہلے کہ اس صحیفہ کی باتیں پُوری ہوں۔ آپ کی پہلی آمد کے زمانہ میں "ابنِ آدم" کو عبدِ یہوواہ کے تصوّر کے مطابق دُکھ سہنا اور لوگوں کی خاطر اپنی جان کو قربان کرنا ضرُور ہے۔ اِس پہلی آمد کا ذکر دانی ایل نبی نے نہیں کیا تھا۔ بلکہ یہ نیا مکاشفہ ہے جو خُداوند کی زبانِ حقیقت ترجمان نے پہلی دفعہ دُنیا پر ظاہر کیا۔
اگر ہم اُن چالیس مقامات پر ایک سطحی نظر ڈالیں جہاں کلمۃ اللہ نے خطاب "ابنِ آدم" اپنے لئے اِستعمال فرمایا ہے تو ہم کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ مقامات دو حصّوں پر منقسم ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے مقامات وہ ہیں جن میں خُداوند اس دُکھ اور مصیبت اور اذیت کا ذکر کرتے ہیں جو "ابنِ آدم" کو برداشت کرنی ہوگی۔ دُوسری قسم کے مقامات وہ ہیں جن کا تعلق خُداوند کی پُرجلال آمدِ ثانی کے ساتھ ہے پس ثابت ہو گیا کہ

کلمۃ اللہ کا یہ خیال تھا کہ آپ خود بنفسِ نفیس "ابنِ آدم" ہیں کہ آپ پہلے "عبد یہوواہ" کی طرح دُکھ اور صلیبی موت کے ذریعہ فتحیاب ہونگے۔ اور پھر جلال کے ساتھ واپس دوبارہ عدالت کے لئے تشریف لائینگے۔ جس طرح یہودی کتب میں "ابنِ آدم" کی بابت لکھا ہے۔ جو مُقدّس پطرس رسُول نے آپ کی مسیحائی کا اِقرار کیا آپ نے بار بار تاکید کر کے اُن پر یہ جتایا کہ "ضرور ہے کہ ابنِ آدم بہت دُکھ اُٹھائے اور قتل کیا جائے۔ اور تین دن کے بعد جی اُٹھے"۔ (مرقس ۸ : ۳۱) پس یسعیاہ کی کتاب کے "عبدِ یہوواہ" کی طرح دُکھ اُٹھانا اور دانی ایل کی کتاب کے "ابنِ آدم" کی طرح جلال میں ہونا یہ دو عنصر تھے۔ جو کلمۃ اللہ نے "ابنِ آدم" کے مفہوم میں داخل کئے۔ ایک طرف تو آپ نے فرمایا کہ "لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے مگر ابنِ آدم کے لئے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں"۔ (متّی ۸ : ۲۰) اور دُوسری طرف ارشاد فرمایا "ابنِ آدم کو زمین پر گناہوں کے مُعاف کرنے کا اِختیار ہے"۔ (متّی ۹ : ۶) حواریوں کو ایک طرف آپ نے فرمایا کہ "ضرور ہے کہ ابنِ آدم قتل کیا جائے"۔ (متی ۱۶ : ۲۳ + لُوقا ۹ : ۲۲) اور دُوسری طرف یہ فرمایا کہ "ابنِ آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آئیگا اُس وقت ہر ایک کو اُس کے کاموں کے موافق بدلہ دیگا۔ (متّی ۱۶ : ۲۷ + یُوحنّا ۵ : ۲۷) پھر فرمایا۔ "اقوامِ عالم ابنِ آدم کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھینگی"۔ (متّی ۲۴ : ۳۰) اور سردار کاہن کو فرمایا۔ "تم ابنِ آدم کو قادرِ مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے (مرقس ۱۴/۶۲)

پس کلمۃ اللہ کے خیال کے مطابق "ابنِ آدم" کی ذات میں صلیبی موت کا پہلو اور الٰہی جلال کا پہلو دونوں شامل تھے۔ لفظ "ابنِ آدم" ارآمی زبان میں کوئی خطاب نہ تھا اور اسی واسطے چُنا گیا تھا کیونکہ اس سے کسی خطاب کی بُو بھی نہ ٹپکتی تھی لیکن خُداوند نے اس معمولی ارآمی لفظ کو لیا اور اس میں اپنی زندگی صلیبی موت۔ فتحیاب قیامت اور ظفریاب آمد کا مفہوم بھر کے اُس کو ایک اعلیٰ ترین خطاب بنا دیا اور دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔" اس ایک تصور سے ہم ابنِ اللہ کی جدت کی گہرائی اور اونچائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں[۱۳]۔"

(۴)

ادعائے مسیح :-

ہم نے اِن خطابات پر جو اناجیل میں ربنا المسیح کے لئے مستعمل ہوئے ہیں ایک تفصیلی نگاہ ڈالی ہے تاکہ معلوم کریں کہ آپ کو اپنی ذات کی نسبت کیا احساس تھا۔ اسی شمولیت میں اب ہم ان ادعا اور کلمات پر نظر کرینگے جو خُداوند مسیح کی زبان حقیقت ترجمان سے صادر ہوئے ہیں۔ اور اناجیل ثلاثہ میں مذکور ہیں تاکہ معلوم ہو کہ آپ کا اپنا خیال آپ کی ذاتِ والا صفات کی نسبت کیا تھا۔ اختصار کی خاطر ہم صرف چند آیات پر ہی اکتفا کرینگے :-

(۱) اُس دِن بہتیرے مجھ سے کہینگے اے خُداوند۔ اے خُداوند کیا ہم نے تیرے نام سے نبوت نہیں کی اور تیرے نام سے بدروحوں کو نہیں نکالا۔ اُس وقت میں اُن سے صاف کہہ دونگا کہ میری کبھی تم

سے واقفیت نہ تھی۔ اے بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ (متی ۷: ۱۲)

(۲) ابنِ آدم کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے (متی ۹: ۶)

(۳) جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا اقرار کرے گا۔ میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے۔ اُس کا اقرار کروں گا جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا انکار کرے گا۔ میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے۔ اُس کا انکار کروں گا" (متی ۱۰: ۳۲-۳۳)

(۴) جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اُسے بچائے گا" (متی ۱۰: ۳۷-۳۹)

(۵) میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے۔ اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے اور اُس کے جس پر بیٹا ظاہر کرنا چاہیے (متی ۱۱: ۲۷)

(۶) ابن آدم اپنے فرشتوں کو بھیجیگا (متی ۱۳: ۴۱)

(۷) ابنِ آدم اپنے باپ کے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آئیگا۔ اُس وقت ہر ایک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کو اُس کے کاموں کے موافق بدلہ دے گا"۔ (متی ۱۶: ۲۷)

(۸) جہاں دو یا تین میرے نام پر اکھٹے ہوں۔ وہاں میں اُن کے بیچ میں ہوں (متی ۱۸: ۲۰)

(۹) ابنِ آدم اس لئے آیا کہ اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیہ میں

دے۔ (متی ۲۰: ۲۸)

(۱۰) داؤد اُس کو خداوند کہتا ہے (متی ۲۲: ۴۵)

(۱۱) دیکھو مَیں دُنیا کے آخر تک ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں (متی ۲۸: ۲۰)

(۱۲) مَیں تم کو اَیسی زبان اور حکمت دُونگا کہ تمہارا کوئی مخالف سامنا کرنے یا خلاف کہنے کا مقدُور نہ رکھیگا۔ (لُوقا ۲۱: ۱۵)

(۱۳) دیکھو جس کا میرے باپ نے وعدہ کیا ہے مَیں اُس کو تم پر نازل کرونگا۔ (لُوقا ۲۴: ۴۹)

(۱۴) تم ابنِ آدم کو قادرِ مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے۔ (متی ۲۶: ۶۴)

اِختصار کی خاطر ہم نے صرف چند آیات پر ہی کفایت کی ہے بخوف طوالت ہم اِن میں سے صرف ایک آیت کو مختصر طور پر تشریح کرینگے۔ یہودی خیالات کے مطابق صرف خدا تعالیٰ ہی "بادلوں" پر سوار ہو سکتا تھا (زبور ۱۰۴: ۳) پس آخری آیت کا یہ مطلب ہُوا کہ کلمۃ اللہ خدا کے خاص حقوق اپنے اِختیار میں رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہ الفاظ سردار کاہن نے خداوند کی زبان سے سُنے اُس نے اپنے کپڑے پھاڑے اور کہا "اس نے کُفر بکا ہے۔ دیکھو تم نے ابھی یہ کُفر سُنا ہے"۔ (متی ۲۶: ۶۵)

اہلِ یہود کے خیالات کے مطابق خدا کی دانش سلیمان میں مجسم ہوئی تھی۔ چنانچہ کتاب "سلیمان کی دانش" ۶: ۲۲ میں لکھا ہے۔ "دانش کیا ہے اور وہ کس طرح وجود میں آئی۔ اس کا حال مَیں تم کو بتاتا ہوں (اس کے بعد سلیمان کی پیدائش کا حال لکھا ہے) مَیں (یعنے سلیمان) اپنی ماں کے رحم میں گوشت بنا وغیرہ"۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دانش نے سلیمان کی صورت میں

مجسم ہو کر اس دنیا میں وجود اختیار کر لیا۔ یہ خیال اہل یہود میں عام طور پر رائج تھا پس انجیل اول میں خداوند کا وہ قول نہایت معنی خیز ہے کہ "دکھن کی ملکہ اس زمانے کے لوگوں کے ساتھ عدالت کے دن اٹھ کر انہیں مجرم ٹھہرائیگی۔ کیونکہ وہ دنیا کے کنارے سے سلیمان کی حکمت سننے کو آئی اور دیکھو یہاں وہ ہے جو سلیمان سے بھی بڑا ہے"۔ (متی ۱۲: ۴۲) کلمتہ اللہ کے سامعین یہ سمجھے کہ دکھن کی ملکہ اس حکمت کو سننے آئی جو سلیمان میں مجسم تھی اور دیکھو اس جگہ خدا کی دانش کا افضل اور کامل اوتار اور بہترین مظہر کھڑا ہے، جس کے مقابلہ میں دانش مجسم سلیمان ایک ناچیز انسان تھا۔

بن سیرخ کی کتاب اکلی زی ایسٹیکس میں دانش خطاب کر کے کہتی ہے۔

اے جاہلو تم میرے پاس آؤ اور تعلیم کے گھر میں رہائش اختیار کرو اپنی گردن دانش کے جوئے تلے کرو اور اس سے سیکھو اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ میں نے تھوڑی ہی محنت اٹھائی اور مجھے کتنا آرام ملا ہے تم دانش کے پاس آؤ تو تمہاری جانیں آرام پائینگی۔ لیکن کلمتہ اللہ جب ان الفاظ کو دہراتے ہیں تو آپ یہ نہیں فرماتے کہ تم الہٰی دانش کے پاس آؤ تو تم آرام پاؤگے بلکہ فرماتے ہیں کہ "تم میرے پاس آؤ میں تم کو آرام دونگا"۔ پھر آپ یہ نہیں فرماتے کہ تم الہٰی دانش کے جوئے تلے اپنی گردنیں کرو اور اس سے سیکھو بلکہ فرماتے ہیں "میرا جوا اپنے اوپر اٹھا لو اور مجھ سے سیکھو تو تمہاری جانیں آرام پائینگی"۔ (متی ۱۱: ۲۸) پس صاف ثابت ہوتا ہے کہ کلمتہ اللہ اپنے آپ کو مجسم الہٰی دانش خیال فرماتے تھے۔

ع ذات او عقل مجسم آمد

کلمتہ اللہ کے اقوال میں سے ایک اور قول کا ہم ذکر کرتے ہیں آپ نے فرمایا "جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا اقرار کریگا۔ میں بھی اپنے باپ کے سامنے

جو آسمان پر ہے اس کا اقرار کرونگا۔ مگر جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا انکار کریگا میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اسکا انکار کرونگا" (متی ۱۰: ۳۲-۳۳) انسانی الفاظ اس سے زیادہ واضح طور پر اس حقیقت کو بیان نہیں کر سکتے کہ انسان کی آخری قسمت کا فیصلہ ربنا المسیح سے وفاداری کرنے پر منحصر ہے۔ جس شخص کے منہ سے یہ الفاظ نکل سکتے ہیں وہ یہ احساس ضرور رکھتا ہوگا کہ وہ خدا اور انسان کے درمیان ایک ایسا رشتہ رکھتا ہے جو کوئی اور شخص نہیں رکھ سکتا۔ کوئی شخص جرأت کر کے ایسے الفاظ زبان پر نہیں لا سکتا جب تک اس کو اس بات کا پختہ یقین نہ ہو کہ وہ خدا اور انسان کے درمیان دونوں طرف سے ایک ایسا رشتہ رکھتا ہے جو لاثانی بے نظیر اور عدیم المثال ہے "خدا ایک ہے اور خدا اور انسانوں کے بیچ میں درمیانی بھی ایک ہے یعنے یسوع مسیح جو انسان ہے" (۱۔ تمطاؤس ۲: ۵) انبیائے سلف نے کبھی ایسے عظیم دعوے نہیں کئے تھے کسی نبی نے نہیں کہا تھا کہ "جو کوئی آدمیوں کے سامنے میرا اقرار کریگا میں بھی اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اس کا اقرار کرونگا"۔ کسی نبی کے وہم و گمان میں بھی یہ کبھی نہ آیا تھا کہ کہے "میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے اور کوئی بیٹے کو نہیں جان سکتا سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے" (متی ۱۱: ۲۷)۔ وہ عظیم الشان ہستیاں یہ یہ اعلان کرنے پر اکتفا کرتی تھیں کہ "خداوند فرماتا ہے"۔ وہ لوگوں کو خدا کے پاس آنے کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن ربنا المسیح کے خیال میں بہترین اور افضل ترین بات یہ تھی کہ خلق خدا آپ کے پاس آئے (متی ۱۲: ۲۸) پس کوئی صحیح العقل شخص آپ کو صرف انبیائے عظام کی صف میں شمار نہیں کر سکتا۔

آپ کے دعوے نہایت عظیم الشان ہیں آپ کے ادعا میں سے تین دعوے خاص طور پر قابلِ غور ہیں :- اوّلاً آپ کا دعویٰ کہ آپ دُنیا کی عدالت کرینگے۔ (متی ۱۶: ۲۷ + یُوحنّا ۵: ۲۷ وغیرہ) ثانیاً آپ کا دعویٰ کہ آپ کو گناہوں کے مُعاف کرنے کا اختیار حاصل ہے (متی ۹: ۶) اور ثالثاً کہ آپ زندگی اور موت کے مالک ہیں۔ عہدِ عتیق کی کُتب گواہ ہیں کہ انبیائے سلف میں سے کسی نے ایسے دعوے کبھی نہ کئے۔ اِن کُتبِ سابقہ سے ظاہر ہے کہ یہ تینوں باتیں خاص خُدا کی ذات کے ساتھ وابستہ تھیں۔ خُدا دُنیا کا بادشاہ ہونے کی حیثیت سے دُنیا کی عدالت کرنے کا اور اپنی مخلوق کے گناہ معاف کرنے کا اور اُن کی زندگی اور موت کے واحد مالک ہونے کا حق رکھتا تھا۔ لیکن اناجیل سے ظاہر ہے کہ منجیٔ کونین نے یہ تینوں دعوے خود اپنی زبان حقائق ترجمان سے کئے۔ آپ کے خطابات ہمارے دلوں پر اتنا فوری اثر نہیں کرتے جتنا آپ کے ادعا اور کلماتِ طیبات کرتے ہیں۔ وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کا مرتبہ اور آپ کی شان اس قدر بلند و بالا ہے کہ کوئی خطاب کماحقہٗ آپ کی اعلیٰ اور ارفع ہستی کو ادا نہیں کر سکتا۔ خُدا نے آپ کو "بہت سربلند کیا اور وہ نام بخشا جو سب خطابوں سے اعلیٰ ہے"۔ (فلپیوں ۲: ۹)

کیا ہم اُس کے قدموں میں آکر اور اُس پر ایمان لاکر نجات حاصل نہ کریں ؟

ع چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما ؟

تصنیفات آرچ ڈیکن برکت اللہ ایم-اے

نور الہدیٰ۔ خواجہ کمال الدین کی کتاب ینابیع المسیحیت کا جواب
حصہ اوّل ۶/ حصہ دوم ۸/

صحت کتب مقدسہ۔ کتاب مقدس کی کتابوں کی صحت کا ثبوت۔ ۱ روپیہ

دین فطرت۔ اسلام یا مسیحیت؟ ۸/

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟ ۸/

دشت کربلا یا کوہ کلوری؟ ۱/

اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی؟ ۵/

مسیحیت یا اشتراکیت؟ ۱/

معجزہ قانائے گلیل۔ ۶/

ایلی ایلی لما شبقتنی ۴/

توضیح البیان فی اصول القرآن ۴/

صلیب کے علم بردار ۸/

مقدس توما رسول ہند حصہ اوّل . ایک روپیہ ۱۲/

صلیب کے ہراول حصہ دوم . . . . ۲ روپیہ

محمد عربی . . . . ۲ روپیہ

مسیحیت اور سائنس ۱/

توضیح العقائد ۸/

ابوّت الٰہی کا مفہوم ۳/

پی - آر - بی - ایس پریس - انارکلی لاہور میں پادری آر گرین سیکرٹری
پنجاب ریلجس بک سوسائٹی پبلشر پرنٹر کے اہتمام سے چھپ
کر شائع ہوئی ۔

2. Plato's Republic.
3. Findlay, Realism of Jesus. p. 28.
4. Fairweather, Jesus and the Greeks. p. 151.
5. Hobhouse, Morals in Evolution. Vol. 1. Ch. 5.
6. Westcott, Commentary on John. Vol. 1. p. 162.
7. Ibid Vol. 1, p. 163.
8. Glover, Jesus of History, p. 127.
9. Dictionary of Christ and the Gospels. Vol. 1. Art Divorce.
10. Seth, Ethical Principles. p. 384. See also Murray, Pagan Religions At the Coming of Christianity in Peak's Commentary. pp. 632-3.
11. Lecky, Hist of European Morals. (Urdu Trans.) by Abdul Majid Vol. 2 pp. 219-220.
12. Canon Liddon, Quoted by Anderson Scott in New Testament Etchics. p. 21.
13. Royce, Problems of Christianity. Vol. 1. p. 85.
14. Quoted by Harnack, What is Christianity ? p. 4.
15. Westcott, Commentary on John. Vol. 1 p. 147.
16. Quoted by Headlam in Life and Teachings of Jesus Christ. p. 82.
17. M. R. James, The Apocryphal New Testament. p. 6.
18. Lecky, Op. Cit. Vol. 2 p. 47.
19. Plato Republic.
20. Lecky, Op. Cit. Vol. 2 p. 5.
21. Montefiore, Religious Teachings of Jesus. p. 133.
22. Lecky Op. Cit. Vol. 2 pp. 51-56.
23. St. Mark (Century Bible Revised ed.) p. 345.
24. "Disinherited Masses." Expression used by Bacon in his Beginning of Gospel Story. (1909).
25. Montefiore, Hibbert Lectures. p. 479.
26. Encycl. Biblica. Vol. 4. p. 4325.